

ISSN 2581-5482

# ادبی سہ ماہی

قیمت: ۲۵ روپے

جون تا اگست ۲۰۱۹ء

ادبی سہ ماہی

ایڈیٹر  
ڈاکٹر سلیم احمد





’ادبی نشین‘ کے محمود الہی نمبر کا رسم اجراء کرتے ہوئے پروفیسر فضل امام  
ساتھ میں ہیں ڈاکٹر اکبر علی مدیر روزنامہ آگ، ڈاکٹر سلیم احمد مدیر ادبی نشین (بائیں جانب)  
پروفیسر فضل امام (درمیان میں) رفعت عزمی ادبی مشیر ادبی نشین اور غفران نسیم سینئر صحافی روزنامہ راشٹریہ سہارا (دائیں جانب)



خدمت خلق کے شعبہ میں سلام لکھنؤ کی جانب سے گوہر ہند اوارڈ حاصل کرتے ہوئے ایڈیٹر ادبی نشین

جون تا اگست ۲۰۱۹ء

ISSN 2581-5482

# ادبی نشیمن

**ADBEE  
NASHEMAN**

Email  
adbeenasheman@gmail.com

قیمت

فی شمارہ : ۲۵ روپے  
سالانہ ممبر شہ مع جرنل ڈاک : ۱۲۵ روپے  
بیرونی مملکت (ہوائی ڈاک) : \$ 15 (امریکی ڈالر)  
لائف ٹائم ممبر شہ : دو ہزار روپے  
لائبریری/ادارہ کیلئے : ۶۵ روپے فی شمارہ

ترسیل زر (منی آرڈر) کا پتہ

سہ ماہی ادبی نشیمن

226003 168/C-544، الماس باغ، ہردوئی روڈ، لکھنؤ

**Bank Detail**

Name : Adbee Nasheman  
Bank : Allahabad Bank, Lucknow  
Branch : Balaganj  
A/c No. : 50489096237  
IFSC : ALLA0212170

**Address**

Editor Urdu Quarterly  
**ADBEE NASHEMAN**  
544-C/168, Almasbagh  
Hardoi Road, Lucknow-03

ایڈیٹر

ڈاکٹر سلیم احمد

Mob.: 8707260591, 9415693119  
saleemahmad110@gmail.com

ادبی مشیر

رفعت عزمی

Mob.: 9451818310  
rafatsafavi@gmail.com

مجلس ادارت

- پروفیسر انور ظہیر انصاری (بڑودہ)
- ڈاکٹر غلام حسین (اجین)
- ڈاکٹر رضی الرحمن (گورکھپور)
- وصی اللہ حسینی (لکھنؤ)
- ڈاکٹر شکیل احمد (منو)

ترتیب کار: وقار حسین رضوی

پرنٹر، پبلشر اور پروپرائٹر احمد رشیق نے نعمانی پرنٹنگ پریس، بارود خانہ، گولہ گنج، لکھنؤ سے چھپوا کر 168/C-544، الماس باغ، ہردوئی روڈ، لکھنؤ سے شائع کیا۔

ایڈیٹر: ڈاکٹر سلیم احمد



# فہرست عناوین

۱ حمد باری..... ہندی گورکھپوری ۳ ۲ نعت..... معراج سائل ۳

## اداریہ

۳ ادارہ..... ایڈیٹر..... ۴

## انٹرویو

۴ اردو کے عاشق، نغموں کے شیدائی، ڈاکٹر ہری اوم..... اشفاق احمد عمر..... ۵

## مضامین

۵ محمد اسد اللہ کے انشائیے..... کے کے کھلر..... ۱۰

۶ اقبال کا تصور خودی (اسرا خودی کی قرآنی بنیاد)..... سید محمود احمد کریمی..... ۱۳

۷ نظیر اکبر آبادی کے عہد میں غزل کے موضوعات و مضامین..... ڈاکٹر ناہیدہ رضوی..... ۱۷

۸ امیر خسرو کے نگہ دار و ممدوح سلطان، وزیر اور صوبے دار..... ڈاکٹر ذاکر حسین..... ۲۰

۹ اردو کی ترقی میں علمائے مدارس کا کردار..... شاداب اختر فلاحی..... ۲۹

۱۰ وقار صدیقی کی تصنیف دوسرے فروش شاعر: ایک جائزہ..... شبانہ بکھت انصاری..... ۳۲

۱۱ کرشن چندر کے مشہور افسانہ 'مہالکشی' کا پیل: کا تجزیاتی مطالعہ..... غلام نبی کمار..... ۳۵

۱۲ بیانید اور اقبال کی شاعری..... اویس احمد بٹ..... ۴۰

۱۳ اندھیروں کے مسافر..... محمد رضوان خان..... ۴۴

۱۴ جوش ملیح آبادی: حیات اور خدمات..... عظمت علی..... ۴۷

## منظومات

۱۵ نظم..... سلیم انصاری..... ۴۹

۱۶ غزل..... مقصود بستیوی، سید عذرا گورکھپوری..... ۶۰

۱۷ غزل..... محمد فہد پاشا، جواد حیدر، جواد..... ۶۱

## افسانے

۱۸ کٹا اور کبوتر..... ریاض توحیدی..... ۵۰

۱۹ کفن کی دکان..... محمد نبیل افروز..... ۵۳

## تبصرے

۲۰ دیوان سعید (حصہ اول)..... ڈاکٹر سعید گورکھپوری..... ۶۲

۶۳ مطالعہ کا سفر (سلیم انصاری)..... شہناز بیگم..... ۶۳

## مراسلات

۲۱ خطوط..... ادارہ..... ۶۴

ہندی گورکھپوری

## حمد باری

وہ کافر ہے یقین جس کو نہ ہو اس ذات باری کا  
یہ عالم ہے کرشمہ گاہ اس کی کردگاری کا  
جو وہ چاہے تو دریوزہ گری میں کج کلاہی ہو  
جو وہ چاہے تو سر پر فقر کے بھی تاج شاہی ہو  
جو وہ چاہے تو ہر ادنیٰ کو اعلیٰ مرتبہ بخشے  
جو وہ چاہے تو گمراہوں کو ظلمت میں ضیا بخشے  
وہ چاہے خاک کے ذروں کو دڑ بے بہا کر دے  
ہر اک موج بلا کو موج ساحل آشنا کر دے  
جو وہ چاہے تو ہر آتش کدہ گلزار ہو جائے  
جو وہ چاہے تو کشتی ڈوب کر بھی پار ہو جائے  
اگر چاہے تو وہ رائی کو پر بت کی بلندی دے  
خس و خاشاک کو بھی عشرت آئینہ بندی دے  
فراز چرخ سے اب بھی من و سلوی اتر آئے  
اگر اس کا اشارہ ہو زمین پر چاند آ جائے  
اگر اس کا اشارہ ہو تو ہر غم عیش بن جائے  
جہنم کے دریچوں سے بھی جنت کی ہوا آئے  
اسی کا فیض ہے کون و مکاں کے کارخانے میں  
وہ بے ہمتا ہے اس کی کردگاری ہے زمانے میں

معراج ساحل

## نعت

جس وقت تصور میں نہ کچھ تیرے سوا ہو  
اس وقت مرے جسم سے یہ روح جدا ہو  
تاریخ نے ایسا نبی دیکھا نہیں اب تک  
امت کے لئے راتوں کو جو سو نہ سکا ہو  
رہ رہ کے دھڑکتا ہے یہ دل جیسے مسافر  
سرکار کے روضے کا پتہ پوچھ رہا ہو  
دربار رسالت میں مری نعت ہو مقبول  
مالک مرے وہ زورِ قلم مجھ کو عطا ہو  
بس نام ہی آ جائے ثناخوانوں میں ان کے  
”حسان کی تقلید کا حق کچھ تو ادا ہو“  
ممکن ہے کہ بن جائے وہ بخشش کا وسیلہ  
آنسو جو تہجد میں ندامت سے گرا ہو  
دولت جو کسی کو ملی کیوں تم کو حسد ہے  
ہو سکتا ہے آقا سے محبت کا صلہ ہو  
اللہ کے محبوب کا پیارا ہے وہ ساحل  
جس سے کسی انساں کا کبھی دل نہ دکھا ہو  
نوٹ: فیض آباد کے ایک نعتیہ مقابلے میں لکھنؤ کی انجمن  
میں جب یہ کلام پڑھا تو نہ صرف یہ کہ اسے اول انعام سے  
سرفراز کیا گیا بلکہ پروگرام کے منتظمین کی جانب سے شاعر کو عمرہ  
کرنے کے لئے مکہ مکرمہ بھی بھیجا گیا۔

## نظریہ



ادبی نشین کا گزشتہ شمارہ مایہ ناز محقق پروفیسر محمود الہی پر مرکوز تھا جو ادبی حلقوں میں بیحد مقبول ہوا۔ اسکی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جیسے جیسے لوگوں کو اس خصوصی شمارے کے بارے میں معلوم ہوتا گیا مطالبہ بڑھتا گیا۔ لہذا کچھ پرچہ بعد میں چھپوا کر لوگوں کو ارسال کیا گیا۔ ادارہ اپنے تمام قارئین کا شکر گزار ہے۔ اس طرح کا خصوصی شمارہ جاری کرنے کی ادارہ کی یہ دوسری کامیاب کوشش رہی ہے۔ لہذا ادبی نشین کے ادارتی بورڈ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ایسی سرکردہ شخصیات جو نام و نمود کی پروا کیے بغیر ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں یادیا ہے، ان پر خصوصی شمارہ شائع کیا جائے۔ اس مناسبت سے آئندہ سمبر میں نامور محقق رشید حسن خاں پر خاص نمبر شائع کرنے کی تجویز ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل ادارہ میں اس بات کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ اتر پردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہوئے تقریباً ۳۱ برس ہو چکے ہیں جبکہ کچھ سال قبل سپریم کورٹ نے اردو کو دوسری سرکاری زبان بنائے جانے سے متعلق تمام اعتراضات مسترد کر دئے تھے مگر حکومت نے اس سلسلے میں کوئی مثبت حکمت عملی اختیار نہیں کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست کی راجدھانی لکھنؤ میں ترقیاتی اور ترقیاتی کام کے جو بھی کام ہوئے یا پھر پارکوں، سیاحتی عمارتوں اور راستوں کے نام کی جوتختی ترقیاتی اتھارٹی یا بلدیاتی ادارے نے لگائی اس پر اردو کو کوئی جگہ نہیں دی گئی۔ اسی طرح میٹرو انتظامیہ نے بھی انہیں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے میٹرو اسٹیشنوں یا دیگر جگہوں پر جوتختی لگا رکھی ہے اس پر صرف ہندی اور انگریزی زبان کو ہی جگہ دی گئی ہے جبکہ ریاست کی دوسری سرکاری زبان اردو کو اس کے حق سے محروم رکھا

گیا۔ تعجب تو اس بات کا ہے کہ تنگ نظری کا یہ کھیل سپریم کورٹ کے احکام کو بالائے طاق رکھ کر کھیلا جا رہا ہے اور ہم بے حس خاموش تماشاخی بنے ہیں۔

لکھنؤ میں آئے دن مختلف ادبی تقریبوں کا انعقاد ہوتا رہتا ہے جن کو سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کی سرپرستی حاصل رہتی ہے۔ لیکن ان اردو پروگراموں کی نشر و اشاعت کے لیے بھی اردو زبان کا استعمال نہیں کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بین الاقوامی شہرت کا حامل جشن لکھنؤ میں بھی اردو سے غائب رہتی ہے۔ حکومت کے غیر منصفانہ رویہ کی وجہ سے مختلف اسکیموں اور پروگراموں کی تشہیر کے لیے بڑی بڑی ہو رڈنگس شہر کے اہم مقامات پر آویزاں کی جاتی ہیں لیکن ان میں بھی اردو کو جگہ نہیں دی جاتی ہے۔

یہ بات تو سرکاری اور نیم سرکاری اداروں سے متعلق ہے۔ حیرت تو اس وقت ہوتی ہے جب شہر کی مختلف ادبی اور ثقافتی تنظیمیں اور اردو سے وابستہ اہم شخصیات کی جانب سے کسی قسم کا کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا جاتا ہے کہ زبان و تہذیب، نفاست اور نزاکت کے اس نوابی شہر میں اردو کو کیوں نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اردو کے تئیں اپنی توقعات صرف حکومت سے وابستہ رکھنا خواب خرگوش میں مبتلا رہنے کی طرح ہے۔

’تاریخ ادب اردو‘ کے مصنف اور ماہر لسانیات ڈاکٹر جمیل جالبی کا ۱۸ اپریل ۲۰۱۹ کو کراچی میں انتقال ہو گیا۔ جمیل جالبی نے درجنوں کتابیں تحریر کیں اور معیاری ترجموں سے اردو کے دامن کو مالا مال کیا۔ بے شک جمیل جالبی کی موت سے اردو تحقیق و تنقید اور ترجمہ نگاری کے ایک بڑے عہد کا خاتمہ ہو گیا۔ ادارہ ان کو خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم احمد

جون ۲۰۱۹ء تا اگست ۲۰۱۹ء

# اردو کے عاشقِ نغموں کے شیدائی: ڈاکٹر ہری اوم

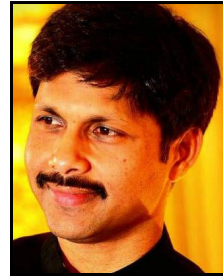
۱۹۹۷ء بچ کے آئی اے ایس افسر ڈاکٹر ہری اوم جہاں تیز طراریڈسٹریبیوڈ افسر کے طور پر جانے جاتے ہیں وہیں نغمہ نگاری اور موسیقی کے میدان میں بھی ان کی الگ شناخت ہے۔ ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کرتے ہیں اور کہانیاں بھی لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر ہری اوم کے دو شعری مجموعے ’دھوپ کا پرچم‘ اور ’روشنی کے پنکھ‘ کے علاوہ کہانیوں کا ایک مجموعہ بھی منظر عام پر آچکا ہے۔ موجودہ وقت میں ڈاکٹر ہری اوم محکمہ السنہ (بھاشا) میں سکریٹری کے عہدے پر فائز ہیں اور اپنی بیحد مصروف ملازمتی زندگی میں سے کسی نہ کسی بہانے وقت نکال کر ادبی ذوق پورا کر لیتے ہیں۔ ڈاکٹر اشفاق احمد عمر نے ادبی نشین کے لئے ڈاکٹر ہری اوم سے تفصیل سے بات کی ہے۔ قارئین کی معلومات میں اضافہ کے لئے پیش ہے اشفاق احمد عمر کا انٹرویو۔ (ایڈیٹر)

اس سے پہلے کی آپ کے ادبی سفر پر گفتگو کریں ہم چاہتے ہیں کہ آپ اپنی پیدائش اور خاندانی پس منظر پر اظہارِ خیال کریں۔

میری پیدائش امیٹھی کے ایک گاؤں کڑاری (سلطان پور) میں ۱۵ جولائی ۱۹۷۱ء کو ہوئی۔ میرا بچپن گاؤں کی سادگی بھرے ماحول میں گزرا۔ میرے ماں باپ ابھی بھی اسی گاؤں میں رہتے ہیں اور میں بھی گاؤں پر کسی خاص موقع یا تیوہار میں جاتا رہتا ہوں۔ حالانکہ وقت کے ساتھ چیزیں کافی بدل گئیں ہیں۔ گاؤں خالی ہو گیا ہے موجِ مستی اب جاتی رہی ہے۔ لیکن میری زندگی کی بنیاد تو وہیں پڑی ہے۔ اس مٹی میں ایک پرانی خوشبو ہے جو مجھے ابھی بھی اپنی آغوش میں لے کر دنیا جہاں بسر کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ ہم دو بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ میرے پاپا کا نام جناب چندر ماں پرشاد، اور می کا نام محترمہ کلاوتی دیوی ہے۔ مجھ سے بڑے ایک بھائی ہیں جن کا نام گھنیشام ہے اور ان کے بعد میں اور میرے بعد دو بہنیں پشپ لکشمی اور سرسوٹی ہیں۔ میری اہلیہ مالویکا ہری اوم ہیں۔ یہ چھوٹا سا گھر ہی میری دنیا ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ آپ اپنے تعلیمی سفر پر روشنی ڈالیں۔ اپنے اساتذہ کرام کے ساتھ کچھ اچھے دوستوں کے متعلق بھی بتائیں؟ تاکہ آپ کی ذہنی تربیت کا اندازہ ہو سکے؟

میری بارہویں تک کی تعلیم گاؤں کے سرکاری ادارے میں ہوئی۔ تب کوئی فیس وغیرہ زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ بستے کا وزن تو بالکل نہیں تھا۔ ٹیوشن گری بھی نہیں تھی۔ اور نہ زیادہ والدین کی طرف سے بچوں پر زور رہتا تھا۔ کہ امتحان میں سو فیصد نمبر لائیں، کل ملا کر تعلیم بھی کھیل کھیل میں ہو جاتی تھی۔ لیکن جو میری پڑھائی چھ سے لے کر آٹھ تک کی تھی اس میں ایک مولوی یعقوب خاں صاحب تھے۔ بڑے بزرگ آدمی اور سائلکل سے پرائمری پانچ سالہ میں پڑھانے آتے تھے۔ نصاب کی مضامین کو وہ زبانی پڑھاتے تھے۔ وہ مجھ سے ہمیشہ کہتے تھے کہ تمہارے اندر کوئی خاص بات ہے۔



ڈاکٹر ہری اوم



اشفاق احمد عمر

تم آگے اچھا کر سکتے ہو۔ تم ہی اس گاؤں سے نکلو گے۔ انھوں نے ہمارے والد کو بھی پڑھایا تھا۔ یقیناً وہ بہت Dedicated استاد تھے۔ مجھے اُن دنوں کا ایک واقعہ ہمیشہ یاد آتا ہے۔ اس وقت آٹھویں میں پہلی بار بورڈ کا امتحان ہوا تھا۔ انھوں نے کہا کہ کلاس میں سب پاس ہوں گے مگر تم اول آؤ گے۔ یہ بات کوئی یقین نہیں کرے گا اشفاق اور یہ جملہ بڑا چیتکاری اور حیرت میں ڈال دینے والا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ مجھے بہت مانتے ہیں اس لیے ایسا کہہ دیا ہوگا لیکن جب ہم لوگوں کا اخبار میں نتیجہ (Result) آیا تو ہمیں لے کر تین بچے اول آئے۔ لیکن جب مارک شیٹ آئی تو صرف میں ہی فرسٹ کلاس پاس ہوا تھا۔ اسی طرح کا ایک واقعہ اور ہے۔ میرے ایک استاد پنڈت دیا رام پانڈے جی تھے۔ جنھیں میں بہت یاد کرتا ہوں۔ وہ مجھے جی آئی سی انٹر کالج میں جغرافیہ پڑھایا کرتے تھے۔ میں آرٹ سائنڈ کا طالب علم تھا چونکہ میرے ذہن میں ہمیشہ یہ بات چلتی تھی کہ آرٹس والے افسر بنتے ہیں اور سائنس والے انجینئر، ڈاکٹر بنتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی میرے والد ہمیشہ کہتے تھے کہ تمہیں افسر بننا ہے۔ جب میں انٹر میں گیا تو میں نے انگریزی، سیویکس، سنسکرت، ہندی لیا۔ میں نے ادب کو شروع سے پکڑ رکھا تھا وہ میرے ساتھ ہمیشہ رہا۔ مجھے بہت لگاؤ تھا اور جو کہانی، شاعری، افسانے میں نے پڑھے ہیں یہ اسی دلچسپی کی دین تھی۔ میرا علاقہ اودھی تھا اور الہ آباد یونیورسٹی جانے پر بھی اودھی سے ملاقات ہوئی۔ ہم لوگ شروع سے اودھی گنگی بولا کرتے تھے اس لیے تلفظ کا خیال نہیں تھا لیکن جب میں نے لکھنا اور

گانا شروع کیا تو کچھ میرے دوست، سینئر اور بھی بہت سارے اساتذہ نے میرا تلفظ صحیح کروایا۔ میں نیشنل لیول کا ڈیبیٹر (Debater) بھی رہا ہوں اور میں نے ڈیبیٹ میں جے۔ این۔ یو کی نمائندگی (Represent) بھی کیا ہے۔ میں شروع سے ہندی میں ہی بولتا تھا۔ چونکہ اس پر میری گرفت بہت اچھی تھی اور اس میں کچھ اشعار پڑھ کر میں سب میں نمایاں بن جاتا تھا۔ جہاں تک مجھے لگتا ہے کہ انگریزی میں وہ خوبصورتی نہیں آتی جو ہندی، اردو ملا کر بولنے میں آ جاتی ہے۔ استاد محترم دیارام جی مجھے بہت مانتے تھے اور بڑی عزت دیتے تھے۔ ہمیشہ کہتے کہ تم یہاں رہنے کے لیے نہیں بنے ہو تمہیں ابھی بہت آگے جانا ہے۔ انھوں نے ایک بار مجھے اپنے چمبر میں بلایا چونکہ انٹر کا بورڈ امتحان ہونے والا تھا۔ وہ کہنے لگے میری خواہش یہ ہے کہ میرا کوئی طالب علم جغرافیہ میں امتیاز (Distinction) لائے۔ اور یہ خواہش پچھلے بیس سالوں سے کوئی نہیں پوری کر سکا۔ تم سے پہلے بھی ایک طالب علم تھا لیکن وہ ۷۳ نمبر ہی لاسکا۔ دیکھو مجھے یہ معلوم ہے کہ تم یہ کام کر سکتے ہو۔ اسے تم میری گرو دکھشنا سمجھو یا جو بھی لیکن مجھے بڑی امیدیں ہیں تم سے۔ خیر امتحان ہوا اور میں اول درجہ سے پاس ہو گیا۔ لیکن اس میں تو یہ معلوم نہیں تھا کہ جغرافیہ میں نمبر کتنا آیا۔ جب کچھ دنوں بعد مارک شیٹ لینے کے لیے اسکول گیا تو انھوں نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور بتایا کہ تمہارے نمبر 78 ہیں۔ تم نے میری لاج رکھ لی، سب سے زیادہ نمبر تم نے ہی لایا ہے۔ انھوں نے میری تصویر جغرافیہ کے لیب میں لگایا۔ یہ دو اساتذہ ایسے ہیں جو مجھے آج بھی یاد ہیں اور ہمیشہ رہیں

گے۔ کیوں کی ان میں ہنر پہنچانے کی صلاحیت تھی۔ میری شخصیت کو نکھارنے و سنوارنے اور مجھے یہاں تک پہنچانے میں ان دو اساتذہ کا بڑا اہم رول رہا ہے۔ میں نے الہ آباد یونیورسٹی سے تاریخ، ہندی اور سیاسیات میں بی۔ اے کیا۔ ہندی ادب نے مجھے اپنی لگاکا جمنی تہذیب یا کہہ لیجئے کہ مشترکہ تہذیب سے کچھ حد تک رو برو کر دیا۔ پریم چند سے لے کر منٹو اور کرشن چندر کی کہانیوں کا میری ذہنی تربیت کرنے میں بڑا اہم رول نبھایا ہے۔ پھر میں الہ آباد سے جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی پہنچ گیا اور ہندی سے ایم اے کیا۔ اس کے بعد ایم۔ فل ڈاکٹر ویر بھرت تلوار (جے۔ این۔ یو) کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کا ناول ہے ”اس چڑیا کا نام: تھے اور شلپ“ کے عنوان سے کیا۔ اسی زمانے میں میرا سیویل سرویسز میں سلیکشن ہو گیا اور میری دو سالہ ٹریننگ کے بعد سب سے پہلی پوسٹنگ ایس ڈی ایم کے طور پر ”رور پریگ“ میں ہوئی۔ چونکہ مجھے پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کا شوق تھا اس لیے میں نے وہیں ڈاکٹر منجلا رانا کی زیر نگرانی گڑھوال یونیورسٹی سے ”کرشنا شوبھتی کے ناول میں استری چتر“ پر ۲۰۰۲ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ آج بھی جے۔ این۔ یو کے کچھ اساتذہ، دوست اور مولوی حضرات کی یاد بڑی شدت کے ساتھ دل و دماغ پر دستک دیتی ہے۔ ساتھ ہی بچپن میں میرے سب سے اچھے دوست جان محمد، اور جگدیش پرشاد کے ساتھ للت کمار تھے جو مجھے بہت یاد آتے ہیں۔ ان کے علاوہ جب میں الہ آباد گیا تو وہ شولا سے میری بہت اچھی دوستی ہوئی اور یہ میرے ساتھ



جے۔ این۔ یو تک رہے۔ انھیں ہم سے پہلے نوکری مل گئی اور وہ لیکچرر ہو گئے۔ ان کے علاوہ بہت سے دوست اور بھی تھے جن میں ایک میری اہلیہ بھی شامل تھیں۔ ان سب کے ساتھ بڑی خوش گوار یادیں جڑی ہوئی ہیں۔

جہاں تک مجھے اس بات کا علم ہے کہ جے۔ این۔ یو کے نصاب کے مطابق ایم۔ اے میں ہندی کے بچوں کو اردو اور اردو کے طالب علموں کو ہندی پڑھنی پڑتی ہے۔ کیا آپ اس روایت سے اتفاق کرتے ہیں؟ وہاں آپ نے اردو پڑھی کی نہیں اور اردو کے کن اساتذہ نے آپ کو پڑھایا۔

جی بالکل صحیح فرمایا آپ نے۔ میں نے اسی طرح اردو پڑھی تھی۔ ایم۔ اے میں اردو کے حروف کی جانکاری اور کچھ شروعاتی نقطہ اور جے ہم نے جے۔ این۔ یو کی اسی روایت کی وجہ سے سیکھے۔ میں اسے ایک نایاب روایت مانتا رہا ہوں۔ شاید یہ ابھی بھی بچی ہو۔ مجھے نام تو ٹھیک سے یاد نہیں ہے شاید جناب مجاہد اور نصیر احمد خاں صاحب ہمارے اردو کے استاذ تھے۔ ۱۹۹۲ سے ۹۷ تک میں جے۔ این۔ یو میں تھا اور اس دوران جو اساتذہ تھے انھوں نے ہمیں اردو پڑھائی ہے۔ ہمیں بنیادی معلومات کے لیے ایم۔ اے میں اردو کا ایک پرچہ پاس کرنا پڑتا تھا اور اسی طرح اردو کے طالب علم کو ہندی کا ایک پرچہ پاس کرنا پڑتا تھا۔ اس وجہ سے دونوں ایک دوسرے کی تہذیب و ثقافت سے واقف ہو جاتے تھے۔

جے۔ این۔ یو جیسی عظیم درس گاہ سے آپ نے تعلیم مکمل کی۔ آپ کو جے۔ این۔ یو کیسا لگا؟ کیا وہاں ادبی ماحول ہے۔ اور آپ نے کبھی

کوئی ادبی یا شعر و شاعری کی محفل سجا ئی یا نہیں۔

دیکھئے جے این یو جیسے تعلیمی ادارے روز روز نہیں بنتے۔ ہم خوش قسمت ہیں جو ہم نے یہاں تعلیم پائی۔ صرف کتابیں ہی نہیں یہاں رہنے کی وجہ سے زندگی جینے، زندگی کو سمجھنے اور دنیا جہان کو لے کر جو سمجھ بنی وہ شاید اس ادارے سے ہٹ کر کبھی بن نہ پاتی۔ جے۔ این۔ یو ہماری یادوں میں گل مہر کے پھول سا کھلا ہے۔ اور موگرے کے پھول سا مہکتا ہے۔ سب کا ایک ساتھ رہنا، لڑکوں کا کھلے پن سے ملنا، باتیں کرنا اور تعلیمی معاملوں میں طلبہ و طالبات کی اپنی کمیٹی کا ہی بحث و مباحثہ سے فیصلہ کرنا، سوچنے اور بات رکھنے کی جو آزادی اس کیمپس میں، کلاس میں اور اس سے باہر تھی وہ شاید اس دیش میں کہیں اور نہ ملے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے شعر کہنا کب شروع کیا تھا۔ لیکن جے این یو میں رہتے ہوئے میں اپنی موسیقی کے لیے کیمپس میں مشہور ہو گیا تھا۔ جب بھی کوئی فنکشن ہوتا تو میرے نغے جے۔ این۔ یو کی فضاؤں کے نذر ضرور ہوتے۔ اور ویسے بھی ہاشل کے کمروں میں، گنگا ڈھابا پر اور مخموں کے ٹیلے پر کئی بار یہ محفل سجتی تھی۔ اس دوران میں ڈائری لکھا کرتا تھا اور اسی میں کبھی کبھار کچھ کوتاہیاں اور شعرو شاعری بھی لکھ لیتا تھا۔

شعر و شاعری میں استادی اور شاگردی کی روایت بہت قدیم ہے۔ آپ نے شاعری میں کسی کو اپنا استاذ بنایا ہے۔

آپ نے صحیح فرمایہ بغیر سیکھے کو تینا اور شاعری نہیں آتی۔ صرف ادب سے پیار آپ کو اچھا لکھنے کا ہنر نہیں دے سکتا لیکن میری بد قسمتی یہ رہی کہ مجھے اپنی شاعری کو

نکھارنے کے لیے کوئی پکا استاد لگا تا نہیں مل سکا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ میرے کام کی اپنی مجبوری اور میرے بے وقت تبادلے۔ لیکن جب بھی کوئی جانکار ملتا ہے میں اسے اپنا کلام ضرور دکھاتا ہوں۔ ہندی اردو کو الگ الگ زبانیں میں نہیں مانتا۔ ہندوستانی زبان میں ہی، جسے اس ملک کی عوام بولتی ہے میں کویتا شاعری اور کہانیاں لگا تا رکھتا رہا، آج بھی لکھتا ہوں۔ ہاں پر فیلڈ میں پرانے نامی لیکچروں اور شاعروں کو پڑھ کر سیکھنے کی کوشش لگا تا جاری ہے۔

آپ کا پہلا شعر کون سا ہے۔ یہ شعر کسی سے متاثر ہو کر کہا گیا یا پھر اس کی کوئی خاص وجہ۔

پہلا شعر تو یاد نہیں لیکن ان شعروں کو میں اپنے شروعاتی شعر کہہ سکتا ہوں۔

دُھند کے اس پار دیکھا کیجیے  
روشنی کی دھار دیکھا کیجیے  
ہاتھ دکھتے ہیں سبھی کے ایک سے  
ہاتھ کے ہتھیار دیکھا کیجیے  
یہ اشعار میری پہلی کتاب ”دھوپ کا پرچم“ سے ہیں۔ اور میں مانتا ہوں کہ تب میں دُشینت کمار کے انداز سے خاصہ متاثر تھا۔

نثر و نظم میں آپ کا رجحان کس طرف زیادہ رہا ہے اور اس کی کوئی خاص وجہ؟

مجھے غزلیں کہنا زیادہ پسند ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ ہے کہ موسیقی سے میری وابستگی، میں ایک نغمہ نگار اور گانگ ہوں، غزلیں گاتا ہوں۔ مہدی حسن، غلام علی اور جگ جیت سنگھ کو کافی سنا اور گایا ہے۔ شاید اسی لیے غزلوں سے پیار گہرا ہے۔ ہاں نظمیں بھی لکھی ہیں اور گائی بھی ہیں۔

سر آپ کس طرح کے شعر کہنا پسند کرتے ہیں۔ پہلی کتاب ”دھوپ کا پرچم“ میں زیادہ تر شعر ترقی پسند ہیں۔ اس میں دنیا جہان کو بدلنے کی ایک نوجوان شاعر کی فکر مندی کا اثر صاف دکھتا ہے۔ لیکن بعد میں شعروں میں عشق محبت زیادہ ہے۔ حالانکہ دشینت والی روایت اب بھی گہرائی سے موجود ہے۔ اس کا ایک نمونہ میں اپنی مشہور غزل ”خوابوں کی ہنسی“ سے ہی دیکھا جاتا ہے۔

میں تیرے پیار کا مارا ہوا ہوں سکندر ہوں مگر ہارا ہوا ہوں اس میں کئی شعر خالص رومانیت سے لبریز ہیں۔ لیکن ساتھ ہی میرے شاعر کو یہ پتا رہتا ہے۔ کہ اس کی شاعری کی منزل کیا ہے۔ شاید تھی وہ یہ شعر بھی کہہ جاتا ہے۔

اوڑوں گا روشنی کے پنکھ لے کر نئی دنیا کا ہر کارہ ہوا ہوں آپ نے Administrative جاب میں رہ کر بھی شعر و شاعری جاری رکھی۔ کوئی خاص وجہ۔ اسے جے این یو کا اثر کہا جائے یا پھر ادب سے آپ کی محبت۔

شاعر فنکار پیدا ہوتے ہیں، ایسا میرا ماننا ہے۔ میں کہیں اور بھی ہوتا تو شاید یہی کچھ کر رہا ہوتا۔ سرکاری نوکری نے مجھے عوام کے اور اس کی زندگی کے مشکلات سے کافی قریب رکھا ہے اور شاید اس نے مجھے ادب اور موسیقی سے اور گہرے جوڑے رکھا ہے۔ ہاں وقت تھوڑا کم ضرور ملتا ہے لیکن، سماج، سسٹم، اور اپنے پریویشن کو زیادہ بڑے فلک پر دیکھنے اور چیزوں کو زیادہ باریکی سے سمجھنے کی سہولت بھی اسی وجہ سے مجھے میسر ہے۔ ادب سے محبت ایک روز میں

پیدا نہیں ہوئی لیکن یہ دھیرے دھیرے بہت گہری ہو چلی ہے۔ جے۔ این۔ یو نے اس میں شوخ رنگ بھرے ہیں۔ جے۔ این۔ یو نے ہمیں ادب اور زندگی کو سمجھنے کا ایک خوبصورت نظریہ دیا ہے۔ جے۔ این۔ یو کے لیے اپنا ایک شعر کہنا چاہوں گا۔

تو مجھ میں اڈٹا ہوا اک رنگ کا دریا میں تجھ سے شرابور مصور کی طرح ہوں آپ نے موسیقی کا فن کہاں سے سیکھا۔ آپ کا ترنم بھی بہت اچھا ہے اور آپ نے کئی گانے بھی گائے ہیں۔ کیا آپ کا کوئی البم بھی منظر عام پر آیا ہے۔

موسیقی مجھے گاؤں کی کھلی وادیوں میں گونجنے والے لوک سنگیت سے ملی۔ بچپن کرتی، نعت، قوالی، ناچ، لٹکنی سب نے مجھے اپنی طرف کھینچا۔ ادھر جو مانگ کر کھانے والے بنجارے بھی آتے تھے وہ گاتے بجاتے آتے تھے۔ اور وہ سُر میرے کانوں میں مسری گھولتے تھے۔ جانے کب ان سب سے مجھے پیار ہو گیا۔ فلمی گانے میرے ہونٹوں پر آگئے۔ گاؤں کے لوگوں کو میرے دوستوں کو اور گھر میں میرے والدین اور رشتہ داروں کو میرا گانا بہت پسند آتا تھا۔ سو یہ رنگ چڑھتا چلا گیا۔ پھر بعد میں کئی جانکار فنکاروں نے مجھے سراہا اور اس طرح سے موسیقی کا سفر میرا آگے بڑھتا چلا گیا۔ میرے دو البم منظر عام پر آچکے ہیں۔ ”انتساب“ اور ”روشنی کے پنکھ“۔ ”انتساب“ میں میں نے فیض احمد فیض کی غزلوں کو گایا ہے اور ”روشنی کے پنکھ“ میں میری خود کی لکھی غزلیں بھی ہیں۔ کئی آڈیو سنگل گانے بھی گائے ہیں۔ میری ساری چیزیں یوٹیوب پر موجود ہیں۔

اردو میں مشاعروں کی روایت بہت قدیم رہی ہے اور عموماً جتنے شعرا حضرات ہیں مشاعروں میں ضرور شریک ہوتے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی کسی مشاعروں میں شرکت کی؟ جی صحیح کہا آپ نے لیکن میں نے بہت کم مشاعروں میں شرکت کی ہے اب تک۔ لیکن جہاں تعینات رہا وہاں شاید کوئی بھی ایسا مشاعرہ رہا ہو جہاں میں نے اپنا کلام نہ پڑھا ہو۔ کچھ بڑے روایتی مشاعروں میں بھی مقبول شاعروں کے ساتھ شعر پڑھنے کا موقع ملا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آج کے بازار و دروازے دور میں بھی اچھا شعر پڑھنے اور سننے والے لوگ کافی تعداد میں موجود ہیں۔

کیا ابھی تک آپ کا کوئی شعری مجموعہ شائع ہوا ہے۔ ان کے نام ہمیں بتائیں۔ میرے دو شاعری کے مجموعہ ”دھوپ کا پرچم“ اور ”روشنی کے پنکھ“ آچکے ہیں۔ پہلا سن ۲۰۰۲ میں آیا تھا اور دوسرا ۲۰۱۶ میں۔ دونوں کو شاعری کے دیوانوں کا بھرپور پیار ملا ہے۔ اردو شاعری میں آپ کن کن شعراء سے متاثر رہے ہیں۔ اور کن لوگوں کو آپ نے پڑھا اور سنا ہے۔

میں نے اردو کے سبھی بڑے شاعروں کو پڑھا ہے۔ مجھے میر، غالب، علامہ اقبال، فیض احمد فیض کے ساتھ ہی مجروح سلطانپوری بھی بہت پسند ہیں۔

آج کی موجودہ اردو شاعری خصوصاً ہندوستان میں آپ کس کی شاعری کو پسند کرتے ہیں۔

آج کے اردو شعرا میں ویم بریلوی، بشیر بدراور راحت اندروی کی شاعری پسند کرتا ہوں۔

کیا آپ نے نام و نمود کے لیے اس میدان کو چننا ہے یا پھر ادب کے دامن کو وسیع کرنا مقاصد و مطلوب رہا ہے؟

نام چاہنے والوں کا نام ہوتے کبھی دیکھا نہیں۔ نام انھیں کا ہوتا ہے جو جنونی ہوتے ہیں اور اپنے فن کے لیے محنت کرنا اور صبر رکھنا جانتے ہیں۔ مجھے لکھنا اور گانا پسند ہے۔ اس سے مجھے بہت ذہنی سکون ملتا ہے۔ اوپر والے نے مجھے ویسے بھی زندگی میں کافی کچھ دیا ہے۔ میں شاعری اور سنگیت میں کچھ تھوڑا بہت اپنی طرف سے بھی جوڑنا چاہتا ہوں۔ اگر وقت نے ساتھ دیا تو۔

یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ آپ نے کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ یہ کہانیوں کو لکھنے کا خیال کہاں سے آپ کے ذہن میں آیا۔ اور آپ نے ابھی تک کتنی کہانیاں لکھی۔ کیا کہانیوں کا کوئی مجموعہ منظر عام پر آیا۔

کہانیاں میری زندگی کے ہر موڑ پر میرا انتظار کرتی رہی ہیں۔ گاؤں کی زندگی سے لے کر الہ آباد، دہلی اور پھر نیدرلینڈ جہاں میں تعلیم کے لیے گیا۔ سب جگہ مجھے ڈھیر وافسانے ملے۔ کئی تو میری ڈائری کے پنے میں درج رہ گئے۔ اور پھر کئی منظر عام پر آ کر داد و تحسین بھی قبول کر چکے۔ میری کہانیوں کی ایک کتاب ”امریکہ میری جان“ شائع ہو چکی ہے۔

گورکھپور کا ادبی منظر نامہ ماضی کے حوالے سے بڑا روشن اور تابناک رہا ہے۔ آپ نے بھی گورکھپور میں اچھا خاصہ وقت گزارا ہے۔ کیا موجودہ دور میں گورکھپور کی ادبی و شعری سرگرمیوں سے آپ مطمئن ہیں؟ کیا مجنوں، فراق، پریم چند کی روایت کو اہل گورکھپور زندہ

رکھ سکیں گے۔

گورکھپور اس شہر کا نام ہے جو بہار کے ساتھ ہی نیپال سے بھی جڑا ہوا ہے۔ وہاں کی فضا میں کویتائی، قصہ گوئی، لوک سنگیت، اور شاعری کے رنگ گھلے ہوئے ہیں۔ مجھے وہاں اچھا وقت بتانے کا شرف حاصل رہا ہے۔ وہاں ادب کی ایک مضبوط روایت رہی ہے۔ فراق، مجنوں، شری چٹڑ مشر، موتی (بی۔ اے)، سے لے کر پرمانند سریواستوا، تک اُس دھارا کو بنائے، بچائے رہے۔ نشی پریم چند نے بھی یہاں کی تاریخ میں اپنی موجودگی درج کی تھی۔ کہتے ہیں کہ ”عید گاہ“ انھوں نے یہیں رہ کر لکھی تھی۔

میں نے بھی اس شہر میں رہتے ہوئے کافی کچھ لکھا تھا۔ ایک تو پوری کویتا ہی میں نے ”یہ جو شہر ہے گورکھپور“ نام سے لکھی جو میری کتاب ”کپاس کے اگلے موسم میں“ شامل ہے۔ میں نے اس میں گورکھپور کی ادبی اور سیاسی، سماجی روایت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ گورکھپور میرے لیے بہت معنی رکھتا ہے۔ گورکھپور کے ایک مشاعرے میں میں نے ایک غزل پڑھی تھی جس کے چند شعر سناتا ہوں۔

جسے چاہت کی دنیا کا نیا دستور کہتے ہیں  
جسے علم و ادب کے حسن سے بھر پور کہتے ہیں  
جسے سب جوہری پورب کا کوہ نور کہتے ہیں  
سنا ہے اس شہر کو لوگ گورکھپور کہتے ہیں  
فراق نے کہا تھا کہ ”انگریزی پڑھ کر آپ Officer بن تو سکتے ہیں لیکن Officer دیکھنے کیلئے آپ کو اردو پڑھنا پڑے گا“۔ اس قول سے آپ کہاں تک اتفاق کرتے ہیں۔ اردو کس طرح لوگوں کے لیے ضروری ہے۔

فراق صاحب انگریزی کے اسکالر تھے۔ لیکن ہم انھیں ایک عظیم شاعر کے بطور جانتے ہیں اور ان کی شاعری میں ہندوستان کی طبیعت بستی ہے۔ ہم جسے دیش یا ملک کہتے ہیں اس پر بھی فراق نے کافی کچھ لکھا ہے۔ اردو صرف ایک مذہب یا Community کی زبان نہیں ہے۔ یہ ہندوستانی عوام کی زبان ہے روزمرہ کام کاج کی زبان ہے۔ یہ ہماری اور آپ کی زبان ہے۔ یہ آپسی میل ملاپ کی زبان ہے۔ اس میں ایک تہذیب بستی ہے اور اردو ایک مکمل تہذیب کا نام ہے۔

اردو پڑھنے اور جاننے سے ہم اس روایت سے واقف ہو سکتے ہیں جو اتری بھارت میں کے سیکڑوں سالوں کی گنگا جمنی تہذیب کو چرائے بسائے اور خود میں سموئے ہوئے ہے۔ وٹی دکنی، امیر خسرو، کبیر، جاسکی، دادو، ملکو، رحیم کون سی زبان بولتے ہیں؟ یہ سیدھا بتانا مشکل ہے۔ اس زبان کو سمجھے بنا خیال گانگی کی روایت کو نہیں سمجھا جاسکتا۔ یہاں تک کی ایک لمبے عرصے تک حکومت اور انصاف کی زبان کے طور پر بھی اردو یا ہندوستانی زبان کا ہی بول بالا رہا ہے۔ اردو یا ہندوستانی زبان کو جاننے سے ہم اس پوری دنیا سے رشتہ جوڑ سکتے ہیں۔ جو اس ملک میں کئی بار الگ تھلک پڑ جاتی ہے۔ یا الگ تھلک کر دی جاتی ہے۔ ہمیں ایک سبک ہندوستانی کی طرح ہندوستان کو جاننے کی کوشش کرنی چاہیے اتر بھارت کی زندگی اور تہذیب میں بہت کچھ ملا جلا ہے اور اسے زبان کی سمجھ سے کافی حد تک سمجھا جاتا ہے۔

□□□

# محمد اسد اللہ کے انشائیے بن تیرے ادب کے گھر بے چراغ ہیں

اردو ادب میں انشائیہ کا مقام اور مرتبہ ہمیشہ مشکوک رہا ہے، جنس سے صنف تک۔ اس ستم ظریف کی طرح جس نے ایک کلب میں ایک لڑکی کو دیکھ کر ساتھ بیٹھے ممبر سے کہا تھا، دیکھئے اس لڑکی نے کیسا لباس پہن رکھا ہے! تو ممبر نے جواباً کہا، وہ لڑکی نہیں لڑکا ہے اور میرا بیٹا ہے۔ پوچھنے والے نے معذرت چاہ لی اور بولا، ساری، مجھے اس بات کا علم نہ تھا کہ آپ اس لڑکے کے باپ ہیں۔

’باپ نہیں میں اس کی ماں ہوں۔‘

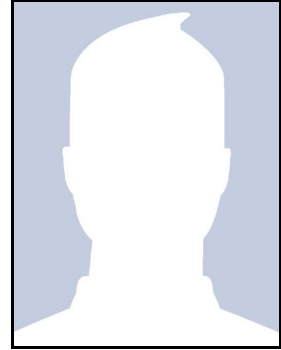
’ذرا دھیرے بول کوئی سن لے گا۔‘

انشائیے کے بادشاہ محمد اسد اللہ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی حادثہ ہوا جب ایک فوجی افسر نے ریٹائرمنٹ کے بعد اخبار کا دھندا شروع کیا تھا اور اس اخبار کے ادبی صفحے کا نگران بھی تھا، محمد اسد اللہ سے پوچھا کہ یہ انشائیہ کیا ہوتی ہے؟ جواب ملا، خان صاحب یہ ہوتی نہیں ہوتا ہے۔ لیکن عالی جاہ! وہاں تو آپ نے دامن بچا لیا۔ لیکن اس کا کیا کیجئے گا۔ جب کوئی ایم اے (اردو) کا طالب علم آپ سے پوچھے گا:

’کیا آپ وہی محمد اسد اللہ ہیں جنہوں نے یہ شعر کہا تھا: مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں۔‘

ایسی حالت میں آپ کے پاس ایک ہی Escape Route ہے جس سے آپ کا دامن تو بچ سکتا ہے لیکن پگڑی نہیں۔ لہذا آپ طالب علم کو گویا چند نارنگ کے پاس بھیج دیں جو اسے اپنی ایک سو پندرویں کتاب میں شامل کر لیں گے یا شمس الرحمن فاروقی کے پاس، مہر لگانے کے لیے، تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔ ویسے بھی ”کام آتا ہے برے وقت میں آتا تیرا۔“، الہ آباد کے اس جام کی طرح جس نے راجندر سنگھ بیدی سے یہ پوچھا تھا کہ آپ کتنے بھائی ہیں تو بیدی نے جواب دیا تھا۔ تین، لیکن تیرے استرے سے بچ گیا تو چار۔

انشائیہ ہر ایک کے بس کا نہیں، بہت کٹھن ہے ڈگر پگھٹ کی



کے کے کھلر

C-8/8338

وسنت کچ، نئی دہلی

رابطہ: 011-26892829

محبت کیلئے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا تو آئیے تھوڑی سی بحث کریں۔ انشائیہ اعظم کسے کہیں۔ محمد اسد اللہ نے اپنی کتاب 'یہ ہے انشائیہ' (۲۰۱۷) میں ۱۰۵ انشائیہ نگاروں کی لسٹ مہیا کی ہے۔ وزیر آغا سے لے کر رام لعل ناہوی سے ہوتے ہوئے زوہبی جعفری تک ۳۹ مجموعے آچکے ہیں، جن میں محمد اسد اللہ کے مجموعے، 'بوڑھے کے رول میں' (۱۹۹۱) اور 'ڈبل رول' (۲۰۱۵)، وزیر آغا کا مجموعہ 'چوری سے یاری تک' (۱۹۶۶)، 'آم کے آم'۔ رام لعل ناہوی، پروین طارق کے 'بولتے سنائے' (۲۰۱۵) پیش پیش ہیں۔ علاوہ ازیں انشائیہ سے متعلق ۲۳ مطبوعات کی لسٹ بھی دی ہے جس میں ڈاکٹر سلیم اختر کی 'انشائیہ کی بنیاد' (۱۹۸۶) اور 'اردو انشائیہ کے ابتدائی نقوش' (لطیف ساحل) اور محمد اسد اللہ کی کتاب 'بعض انشائیہ کی روایت، مشرق و مغرب کے تناظر میں' اہم ہیں۔ جہاں تک تنقید کا تعلق ہے اردو میں انشائیے پر ڈاکٹر انور سدید کی کتاب 'انشائیہ اردو ادب میں' (۱۹۸۵) کو حرف آخر تسلیم کیا جا چکا ہے جس میں انشائیے کے تیور، اس کے خد وخال، اس کے ناز اور خرمے، اس کے داؤ پیچ کھل کر بیان کئے گئے ہیں۔ انشائیہ پر بحث اس کتاب کے مطالعے کے بغیر ادھوری ہے۔ ورنہ انشائیہ وہیں کا وہیں کھڑا رہا جائے گا جہاں چالیس سال پہلے تھا۔

میرے خیال میں یہ طے کرنے کے لیے کہ انشائیہ کیا ہے، بہتر یہی ہوگا کہ یہ فیصلہ ہو جائے کہ انشائیہ کیا نہیں ہے۔ پیدل تو سبھی چل رہے ہوتے ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ کم گہرا کون

ہے؟ پہلی شرط یہ ہے کہ انشائیہ طنز و مزاح سے کوسوں دور ہے۔ انیس ناگی کا فرمان ہے کہ اگر ہنسی مذاق، بھبتی اور جگت سے انشائیہ جنم لیتا ہے

انشائیہ نہ کوئی معمہ ہے نہ معجزہ، انشائیہ میں کوئی جملہ دوبارہ نہیں کہا یا لکھا جاتا۔ کوئی بات ایک بار کہہ دی تو کہہ دی اور نہیں کہی وہ کہی ہوئی بات سے زیادہ معنی خیز ہے۔ بقول وزیر آغا سر گودھوی، 'معمولی شے کے غیر معمولی پن کو سطح پر لانے کا نام انشائیہ ہے'، کھلی ہوا میں ایک پرندہ پروں سے اڑنا بھول گیا۔ انشائیہ میں قہقہہ لگانے کی اجازت نہیں ہے اسے ہنسنے کے لیے اپنا Pan نمبر اور رونے کے لئے آدھا رکھنا پڑے گا۔ جب وہی رونا چاہتا ہے تو اس کے پاس ٹائم نہیں اور ہنسنے کے لیے ٹائم نہیں۔ انشائیہ میں کھل کر بات نہیں ہوتی، بس آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ ہو جاتا ہے۔ صرف مسکراہٹ کی گنجائش ہے وہ بھی زیر لب۔ اس میں اصل چیز موضوع نہیں ہے۔ انشائیہ سچائی کا ڈھنڈھورا نہیں پیٹتا بلکہ جھوٹ کو قابل برداشت بنادیتا ہے۔ اس میں بات بنتی نہیں بنائی جاتی ہے۔ مضمون کی طوالت کے پیش نظر یہی کہوں گا اس کی وضاحت تک پہنچنے کے لیے محمد اسد اللہ کے منتخب انشائیے بہ عنوان "دوسرا ٹکٹ" مرتبہ ڈاکٹر اظہر ابرار (۲۰۰۹) ضرور پڑھئے۔ کرشن چندر کا 'الٹا درخت' اور منٹو کے 'سیاہ حاشے' بھی انشائیے کی زد سے نہیں بچ سکے۔ قصہ کوتاہ دریا کو کوزے میں بند کرتے ہوئے حافظ کرناٹکی نے صحیح لکھا ہے کہ 'لوگوں کے بکھرتے خواب'۔ اڑے دل اور ادھورے ارمانوں کی ادبی کاوش کا نام انشائیہ ہے یعنی بے معنی باتوں میں معنی کی تلاش۔ (دوسرا ٹکٹ)

کے مجموعے ہیں۔ موٹی بات یہ ہے کہ انشائیہ کو طنز و مزاح کے دائرے میں لانا اپنے آپ میں طنز و مزاح ہے۔

انشائیہ نہ کوئی معمہ ہے نہ معجزہ، انشائیہ میں کوئی جملہ دوبارہ نہیں کہا یا لکھا جاتا۔ کوئی بات ایک بار کہہ دی تو کہہ دی اور نہیں کہی وہ کہی ہوئی بات سے زیادہ معنی خیز ہے۔ بقول وزیر آغا سر گودھوی، 'معمولی شے کے غیر معمولی پن کو سطح پر لانے کا نام انشائیہ ہے'، کھلی ہوا میں ایک پرندہ پروں سے اڑنا بھول گیا۔ انشائیہ میں قہقہہ لگانے کی اجازت نہیں ہے اسے ہنسنے کے لیے اپنا Pan نمبر اور رونے کے لئے آدھا رکھنا پڑے گا۔ جب وہی رونا چاہتا ہے تو اس کے پاس ٹائم نہیں اور ہنسنے کے لیے ٹائم نہیں۔ انشائیہ میں کھل کر بات نہیں ہوتی، بس آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ ہو جاتا ہے۔ صرف مسکراہٹ کی گنجائش ہے وہ بھی زیر لب۔ اس میں اصل چیز موضوع نہیں ہے۔ انشائیہ سچائی کا ڈھنڈھورا نہیں پیٹتا بلکہ جھوٹ کو قابل برداشت بنادیتا ہے۔ اس میں بات بنتی نہیں بنائی جاتی ہے۔ مضمون کی طوالت کے پیش نظر یہی کہوں گا اس کی وضاحت تک پہنچنے کے لیے محمد اسد اللہ کے منتخب انشائیے بہ عنوان "دوسرا ٹکٹ" مرتبہ ڈاکٹر اظہر ابرار (۲۰۰۹) ضرور پڑھئے۔ کرشن چندر کا 'الٹا درخت' اور منٹو کے 'سیاہ حاشے' بھی انشائیے کی زد سے نہیں بچ سکے۔ قصہ کوتاہ دریا کو کوزے میں بند کرتے ہوئے حافظ کرناٹکی نے صحیح لکھا ہے کہ 'لوگوں کے بکھرتے خواب'۔ اڑے دل اور ادھورے ارمانوں کی ادبی کاوش کا نام انشائیہ ہے یعنی بے معنی باتوں میں معنی کی تلاش۔ (دوسرا ٹکٹ)



امید اور انتظار انشائیے کے دو بنیادی عنصر ہیں۔ یونانی فاتح سکندر اعظم جس نے پنجاب کے صرف ۲۲ گاؤں پر قبضہ کیا تھا تاریخ میں اسے سکندر کہتے ہیں۔ اور جو دولت، سونا، چاندی، ہیرے جواہرات کی شکل میں اس کے ہاتھ لگا اس نے سب کے سب اپنی فوج میں بانٹ دئے۔ تو سیلوکس (سکندر کا سپہ سالار) نے پوچھا: حضور! آپ نے اپنے لیے کیا رکھا ہے؟ تو سکندر کا جواب تھا: امید اور انتظار۔ اور جب میرے ہم وطن پوچھیں گے کہ ہندوستان سے کیا لائے ہو، تو میرا جواب وہی ہوگا۔ امید اور انتظار! لیکن دیوتاؤں کو یہ منظور نہیں تھا۔ کیونکہ اس نے دیوتاؤں کی آگ چرائی تھی۔ اور جو رہی سو بے خبری رہی۔ لہذا کوئی یونانی شاعر اس واقعے پر انشائیہ نہ لکھ سکا۔

انشائیہ نا عاشقانہ حقیقتوں کی عاشقانہ تشریح ہے جن میں نظیر صدیقی کے الفاظ میں حکمت سے لے کر حماقت تک ساری منزلیں طے ہو جاتی ہیں سوائے ایک منزل کے یعنی منزل مقصود۔

پیاسوں کے مقدر میں نہ آیا کوئی قطرہ کہتا رہا دریا کہ نیا سال مبارک انگریزی میں انشائیہ کا نام Essay ہے۔ یہ فرانسیسی کا لفظ ہے اور عربی سے لیا گیا ہے۔ اس کے معنی میں 'ادبی کاوش' اس کے لغوی معنی ہیں۔ ایک مختصر نثری اور ادبی تحریر بلا امتیاز مضمون یا موزوں یا مقصد۔ نہ کوئی معہ ہے نہ معجزہ۔

انگریزی لغت کے بانی Dr. Samuel Johnson نے اسے A loose sally of mind کہا یعنی ذہن کی

آزاد ترنگ۔ کچھ ناقدین نے اسے ذہن کی آوارہ خیالی سے منسوب کیا۔ اردو میں پہلا انشائیہ ۱۹۵۸ کے قریب لکھا گیا لیکن فرانس میں انشائیے کے بانی مانتین Montaigne نے اسے ۱۵۷۱ء میں منظر عام پر لایا۔ ہندوستان میں اسے انگریزی کے اخبارات مختلف ناموں سے چھاپتے رہے ہیں۔ جیسے ٹریبون میں اس کا نام تھا، Of my head، انڈین ایکسپریس میں Time out، سٹیشن میں Now Again۔ مانتین نے اپنے انشائیوں

انگلستان میں ایڈیسن اور اسٹیل کے انشائیے کافی مقبول ہوئے۔ جیسے ہندوستان میں انڈین ایکسپریس اور سٹیشن میں۔ یہ دو اخبار ایسے تھے جن کے انشائیوں پر بھی بحث ہوتی تھی۔ اسٹیشن کے قاری تو آج بھی سب سے پہلے ایڈیٹوریل کو کھولتے ہیں۔ وہ انشائیہ پڑھنے کے بعد فرنٹ صفحے کی ہیڈ لائنس دیکھتے ہیں۔ میرا انشائیہ جب بھی اس اخبار میں چھپتا ہے میرا فون نان اسٹاپ بچتا ہے اور بیوی نان اسٹاپ ریڈیو لگا دیتی ہے۔

کو ہم وجود کا نام دیا۔

انگلستان میں ایڈیسن اور اسٹیل کے انشائیے کافی مقبول ہوئے۔ جیسے ہندوستان میں انڈین ایکسپریس اور سٹیشن میں۔ یہ دو اخبار ایسے تھے جن کے انشائیوں پر بھی بحث ہوتی تھی۔ اسٹیشن کے قاری تو آج بھی سب سے پہلے ایڈیٹوریل کو کھولتے ہیں۔ وہ انشائیہ پڑھنے کے بعد فرنٹ صفحے کی ہیڈ لائنس دیکھتے ہیں۔ میرا انشائیہ جب بھی اس اخبار میں چھپتا ہے میرا فون نان اسٹاپ بچتا ہے اور بیوی نان اسٹاپ ریڈیو

لگا دیتی ہے۔ محمد اسد اللہ کے انشائیوں میں ساز بھی ہے اور سوز بھی۔ بقول انور سدید 'انشائیہ اندھیرے کے جگنو کی طرح ہے جو منزل کی امید تو دلاتا ہے لیکن خود منزل نہیں بتا۔ انشائیہ میں عصری آگہی معروضی نہیں بلکہ انشائیہ عصری آگہی کو بھی ایک نئی لو کے تاثر میں تبدیل کر دیتا ہے۔ لہذا آج انشائیہ عصری حقیقت بن چکا ہے جیسا بوڑھے کے رول میں، دوسرا ٹکٹ، گنگنانا۔ محمد اسد اللہ لکھتے ہیں کہ 'گنگنانا اور نہانا دونوں کا پیدائشی وطن ایک ہی ہے، حمام خانہ۔ گانا ایک سماجی عمل ہے اور گنگنانا ایک انفرادی فعل'۔ میں زندگی کے ساتھ بہت دور تک گیا یہ اور بات ہے کہ تعارف نہ ہو سکا بہر کیف انشائیہ ایک دریائے عشق ہے اور ہر عاشق کو ڈوب کے جانا ہے۔ اپنا مضمون ایک قصے پر ختم کرتا ہوں۔

جب آدمی شکر آچار یہ منڈن مشرا سے ایک اہم ویدک بحث کرنے بہار کے شہر گیا میں پہنچے تو ایک پھول بیچنے والی ماں سے منڈن مشرا کے گھر کا رستہ پوچھا۔ ماں بولی: جوگی سیدھے چلے جاؤ، گلی کے ٹکڑ پر جس صحن میں طوطے وید پاٹھ کر رہے ہوں وہی منڈن مشرا کا گھر ہے۔ حسب شرط بحث شکر آچار یہ کو سر سوتی کو ایک سو ایک پیلے گلاب کے پھول چڑھانے تھے۔ بحث کی امپائر Umpire یعنی منڈن مشرا کی بیوی نے جب پھول گنے تو ایک پھول کم تھا۔ شکر آچار یہ اسی پھول کی تلاش میں نکل پڑا۔ تلاش آج تک جاری ہے۔

میرے خیال میں محمد اسد اللہ بھی گم شدہ پھول کی جستجو میں محو ہے۔ دیکھئے کیا ہو۔

□□□

جون ۲۰۱۹ء تا اگست ۲۰۱۹ء

# اقبال کا تصور خودی (اسرار خودی کی قرآنی بنیاد)

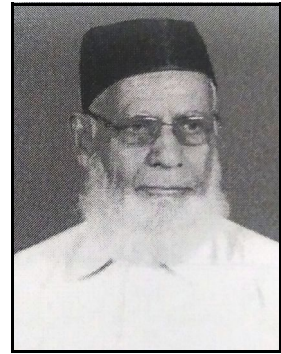
علامہ اقبال نے ’رموز بے خودی‘ میں سرکارِ دو عالم سے عرض حال کے سلسلہ میں یہ بیان کیا ہے کہ:

گر دلم آئینہ بے جوہر است  
وَر بحر فہم غیر قرآن مضمحل است  
اے فروغت صبح اعصار و دھور  
چشم تو بیندہ مافی الصدور  
پردہ ناموس فکرم چاک کن  
ایں خیادباں راز حارم پاک کن  
تنگ کن رحمت حیات اندر برم  
اہل ملت را نگہدارا ز شرم  
روز محشر خوار و رسوا کن مرا  
بے نصیب از بوسہ باکن مرا

(اسرار خودی، ص ۱۹۵ و ۱۹۶)

ان اشعار سے ثابت ہو گیا کہ اسرارِ رموز میں جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ سب قرآن حکیم سے ماخوذ ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص ان مثنویوں کا مطالعہ کرے گا تو اقبال کے اس بیان کی صداقت اس پر واضح ہو جائے گی۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ ۱۹۱۱ء میں جب انہوں نے قرآن حکیم کی اس آیت شریفہ میں تدبر کیا: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ....** (اے لوگو! جو ایمان لائے ہو! تم اپنے ہی نفوس کے ذمہ دار ہو۔ جو گمراہ ہو گیا۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا اگر تم ہدایت پر رہو۔) (سورہ مائدہ، آیت ۱۰۶)



سید محمود احمد کریمیی ایڈووکیٹ

سینا پتھ کالونی  
لال باغ، درہنگہ (بہار)  
رابطہ: 9631355367

تو یہ حقیقت مجھ پر آشکار ہو گئی کہ ہر مسلمان پر اپنی خودی کا استحکام فرض ہے۔ بس میں نے اسی آیت شریفہ کو اپنے فلسفہ خودی کا سنگ بنیاد بنایا۔

واضح ہو کہ علامہ نے اپنی عمر کا معتد بہ حصہ فلسفیانہ غور و فکر میں بسر کیا چنانچہ وہ خود کہتے ہیں:

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں کبھی سوز و ساز روزی کبھی پیچ و تاب رازی انہوں نے تمام مسائل پر غور کیا جو ایک فلسفی کے دماغ میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ مثلاً میں کیا ہوں، یہ کائنات کیا ہے، ان دونوں میں کیا ربط ہے؟ انسان کی غایت کیا ہے؟ اس کے حصول کا طریق کیا ہے؟ حقیقت کیا ہے؟ انسان کو اس کا علم ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اگر ہو سکتا ہے تو اس کا طریق کیا ہے؟ انسان میں حقیقت سے ہمکنار ہونے کی آرزو کیوں پائی جاتی ہے؟ اور اس مقصد میں کامیابی کا طریق کیا ہے؟ وغیرہ علامہ اقبال نے ان تمام مسائل پر ایک مسلمان کی حیثیت سے غور کیا، یعنی قرآن حکیم کو اپنے فلسفیانہ افکار کی بنیاد بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا فلسفہ جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں، اللہ کی کتاب سے ماخوذ ہے۔ ان کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ اسرار خودی سے لے کر ارمغان مجاز تک جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اس کو ہم پانچ عنوانات کے تحت تقسیم کر سکتے ہیں:

۱۔ اثبات خودی

۲۔ احساس خودی

۳۔ تربیت خودی

۴۔ تکمیل خودی

۵۔ ثمرہ تکمیل خودی

اسرار خودی کے بعد تادم وفات جو کچھ انہوں نے لکھا اس کا محور یہی پانچ عنوانات ہیں۔

واضح ہو کہ علامہ نے اپنی عمر کا معتد بہ حصہ فلسفیانہ غور و فکر میں بسر کیا چنانچہ وہ خود کہتے ہیں:

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں کبھی سوز و ساز روزی کبھی پیچ و تاب رازی انہوں نے تمام مسائل پر غور کیا جو ایک فلسفی کے دماغ میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ مثلاً میں کیا ہوں، یہ کائنات کیا ہے، ان دونوں میں کیا ربط ہے؟ انسان کی غایت کیا ہے؟ اس کے حصول کا طریق کیا ہے؟ حقیقت کیا ہے؟ انسان کو اس کا علم ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اگر ہو سکتا ہے تو اس کا طریق کیا ہے؟ انسان میں حقیقت سے ہمکنار ہونے کی آرزو کیوں پائی جاتی ہے؟ اور اس مقصد میں کامیابی کا طریق کیا ہے؟ وغیرہ

علامہ اقبال نے ان تمام مسائل پر ایک مسلمان کی حیثیت سے غور کیا، یعنی قرآن حکیم کو اپنے فلسفیانہ افکار کی بنیاد بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا فلسفہ جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں، اللہ کی کتاب سے ماخوذ ہے۔ ان کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ اسرار خودی سے لے کر ارمغان مجاز تک جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اس کو ہم پانچ عنوانات کے تحت تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ اثبات خودی ۲۔ احساس خودی

۳۔ تربیت خودی ۴۔ تکمیل خودی

۵۔ ثمرہ تکمیل خودی

خودی یا انانیت کا لفظ اردو میں کبر و غرور کے معنوں میں آیا کرتا ہے مگر اقبال نے اسے

ایک فلسفیانہ اصطلاح کے طور پر اس احساس اور عقیدے کے لئے استعمال کیا ہے کہ فرد کا نفس یا انا گو ایک مخلوق اور فانی ہستی ہے لیکن یہ ہستی اپنا ایک علیحدہ وجود رکھتی ہے جو عمل سے پائیدار اور لازوال ہو جاتا ہے۔ اسرار خودی کے دیباچے میں علامہ فرماتے ہیں:

’یہ لفظ انا اس نظم میں بہ معنی غرور استعمال نہیں کیا گیا جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے۔ اس کا مفہوم محض احساس نفس اور تعین ذات ہے۔‘

یہی خودی کا تصور اقبال کے فلسفہ حیات و کائنات کی بنیاد ہے۔

خودی اپنی تکمیل اور استحکام کے لئے غیر خود سے لگراتی ہے اور اسی تصادم کے ذریعہ سے اس کی اندرونی قوتیں نشو و نما پاتی ہیں اور وہ بتدریج سلسلہ ارتقا کو طے کرتی ہے۔ اس کی ہستی مسلسل حرکت اور عمل پیہم کشمکش اور کارزار ہے۔ جس نسبت سے کوئی شے اپنی خودی میں مستحکم اور غیر خودی پر غالب ہے، اسی نسبت سے اس کا درجہ مدارج حیات میں متعین ہوتا ہے۔

پیکر ہستی ز آثار خودی است  
ہر چہ می بینی ز اسرار خودی است  
خویشتن را چوں خودی بیدار کرد  
آشکارا عالم پندار کرد  
صد جہاں پوشیدہ اندر ذات او  
غیر او پیدا است از اثبات او  
چوں حیات عالم از زور خودی است  
پس بہ قدر استواری زندگی است  
جس طرح انسانی زندگی کا نقطہ آغاز اپنی خودی کا شعور ہے، اسی طرح اس کی منزل مقصود یہ ہے کہ خودی کو روز بروز مضبوط اور مستحکم کرتا

جون ۲۰۱۹ء تا اگست ۲۰۱۹ء

جائے۔ خودی کے استحکام کی یہی صورت ہے کہ انسان غیر خود سے یعنی اپنے طبعی ماحول سے مسلسل جنگ کرتا ہے۔ یہ اس طرح ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے لئے نئے نئے مقاصد متعین کرتا ہے اور انہیں حاصل کرنے کی سعی میں سرگرم رہتا ہے۔ اس میں اسے اپنے ماحول میں تصرف کرنا، اپنی راہ سے رکاوٹوں کو دور کرنا اور مشکلات کا مقابلہ کر کے ان پر غالب آنا پڑتا ہے۔ اس طرح اس کی ذہنی اور عملی قوتیں برابر تیز ہوتی رہتی ہیں اور اس کے سینے میں خودی کی آگ روز بروز مشتعل ہوتی جاتی ہے۔

زندگانی را بقا از مدعا است  
کار دانش را دراز از مدعا است  
زندگی در جستجو پوشیدہ است  
اصل او آرزو پوشیدہ است  
از تمنا رقص دل در سینہ ہا  
سینہ از تاب او آئینہ ہا  
پس مسلمان اگر موجودہ صدی میں زندہ رہنے کا آرزو مند ہے تو اسے اپنی خودی کا جائزہ لینا چاہئے کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ انسان آمد و شد نفس سے عبارت نہیں، خواب و خورش زندگی کا ثبوت نہیں۔ کیونکہ یہ کام حیوانات بھی کرتے ہیں۔ انسان زندہ وہ ہے جس کی خودی زندہ ہو اور خودی کی حیات کا تسلسل، تخلیقی مقاصد پر منحصر ہے۔ اس لئے ہر مسلمان نوجوان کے سامنے کوئی نصب العین بھی ہونا ضروری ہے۔

ما ز تخلیق مقاصد زندہ ایم  
از شعاع آرزو تابندہ ایم  
اب سوال یہ ہے کہ وہ مقاصد کیا ہیں؟  
علامہ اقبال اس کا جواب دیتے ہیں کہ مسلمان کا نصب العین دنیاوی نہیں ہوتا بلکہ

سراسر نوری اور سماوی کا نصب العین ایسا ہوتا ہے کہ جو ماسوا اللہ کو جلا کر خاک سیاہ کر دے۔ باطل کی ہستی کو فنا کر دے اور اس قدر بلند ہو کہ آسمان بھی اس کی رفعت کے سامنے ہیچ ہو۔ مقصدے مثل سحر تابندہ اے  
ما سوا را آتش سوزندہ اے  
مقصدے از آسمان بالاتر ہے  
دلربائے دلستائے دلبرے  
مختصر یہ کہ مسلمان کا مقصد دنیا طلبی نہیں خدا طلبی ہے۔

در دشت جنوں من جبریل زبوں صیدے  
یزدان بہ کمند اور اے ہمت مردانہ  
خودی عشق و محبت سے مستحکم ہوتی ہے۔  
اس کے استحکام کی صورت یہ ہے کہ خودی کی فطرت کو عشق کے ساتھ اس قسم کا تعلق ہے کہ عشق اس کے جوہر کو مشتعل کر دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خودی کی مخفی صلاحیتیں ارتقا پذیر ہو جاتی ہیں اور ارتقائی اس کے استحکام کا باعث ہوتا ہے۔

از محبت اشتعال جوہر ش  
ارتقائے ممکنات مضمشر  
سطور بالا میں لکھا جا چکا ہے کہ خودی کی فطرت کو عشق کے ساتھ ایک قسم کا تعلق ہے تو اس لئے ضروری ہے کہ عشق کی ماہیت بتائی جائے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ عشق ایک لطیفہ نوری ہے۔ اس کی اصل مادی یا دنیاوی نہیں ہے۔ اس لئے اس کو تیغ و خنجر کا خوف نہیں کیونکہ یہ چیزیں مادیات کو قطع کر سکتی ہیں نہ کہ ”نور“ کو۔ عشق میں یہ طاقت ہے کہ اس کی ایک نگاہ غلط انداز سے سنگ خارا بھی شق ہو جاتا ہے۔ عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق

عشق نہ ہو تو شرع و دین بتکدہ تصورات  
چونکہ خودی کے استحکام کا دنیا میں صرف یہی ایک ذریعہ ہے اس لئے ہر مسلمان کو عاشق صادق بن جانا چاہئے۔ اس کی آنکھ نورؔ کی اور دل ابوبؔ کا ہونا چاہئے۔

عشق را از تیغ و خنجر پاک نیست  
اصل عشق از آب و باد و خاک نیست  
عشق کس سے کرنا چاہئے؟ وہ معشوق مسلمان کے دل میں پوشیدہ ہے اور وہ ہیں سرور انبیاء، محبوب کبریا، محمد مصطفیٰؐ۔

در دل مسلم مقام مصطفیٰ است  
آبروئے ماز نام مصطفیٰ است  
عشق محمدی کی مثال کیا ہے؟ نالہ فریاد نہیں، آہ و فغاں نہیں، نہیں اختر شکاری اور بے قراری۔ تقلید اتباع کا ملہ۔ تقلید کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا؟ خدا تمہارا ہو جائے گا۔

قَالَ اللَّهُ تَعَالَى: قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ  
عاشقی؟ محکم شواہز تقلید یار  
تا کمند تو کند یزدان شکار  
جب خودی عشق و محبت اور فقر و استغنا سے مستحکم ہو جاتی ہے تو کائنات کی ساری قوتیں انسان کے قبضہ میں آ جاتی ہیں۔

از محبت چوں خودی محکم شود  
قوتش فرماندہ عالم شود  
پنجہ او پنجہ حق می شود  
ماہ از انگشت او شق می شود  
مگر خودی غیر محدود قوت تعمیر و تخریب دونوں طرح کا کام کرتی ہے۔ خودی سے تعمیر کا کام لینے کے لئے توسیع کے ساتھ ساتھ اس کی تادیب اور تربیت بھی ضروری ہے۔ (بے قید اور

بے تربیت خودی کی مثال شیطان ہے، جس کے متعلق علامہ اقبال کا نظریہ نہایت دلچسپ ہے۔ وہ اسے بدی کی قوت نہیں بلکہ خودی اور تخلیق کی عظیم الشان قوت سمجھتے ہیں جو محبت و اطاعت کی راہ مستقیم سے بھٹک گئی ہے۔ (خودی کی تادیب و تہذیب کا پہلا درجہ اطاعت ہے یعنی اس قانون حیات کی پابندی جو خالق عالم نے ہر مخلوق کے لئے مقرر کیا ہے۔

#### مرحلہ اول: اطاعت

دراطاعت کوش اے غفلت شعار  
می شود از جبر پیدا اختیار  
هر کہ تسخیر مہ و پرویں کند  
خویش را زنجیری آئیں کند  
باز اے آزاد دستور قدیم  
زینت پا کن ہماں زنجیر سیم  
شکوہ سنج سختی آئیں مشو  
از حدود مصطفیٰ بیروں مرد  
حکم دشوار اسے تادیلے مجو  
جز بہ قلب خویش قندیلے محو

#### مرحلہ دوم: ضبط نفس

تربیت خودی کا دوسرا مرحلہ ضبط نفس ہے یعنی انسان اپنے نفس کی ادنیٰ قوتوں کو جن کی سرکشی کی کوئی حد نہیں ہے، قابو میں لائے خصوصاً انسانی محبت اور خوف کے جذبات جو سب سے زیادہ قوی ہیں، ان پر اقتدار اور غلبہ تام حاصل کرے۔ جو شخص اپنے نفس پر حکومت نہیں کر سکتا، لازمی ہے کہ اس کے علاوہ دوسری طاقتیں اس کے نفس پر حکمران ہو جائیں گی۔

هر کہ بر خود نیست فرمائش رواں  
می شود مان پذیر از دیگران  
نفسیاتی زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو

انسان کی فطرت دو چیزوں سے مرکب ہے۔  
خوف اور محبت۔

نفس تو مثل شتر خود پرور است  
خود پرست و خود سوار و خود سراسر است  
مرد شو آور زمام او بکف

خودی عشق و محبت سے مستحکم ہوتی ہے۔  
اس کے استحکام کی صورت یہ ہے کہ خودی کی فطرت کو عشق کے ساتھ اس قسم کا تعلق ہے کہ عشق اس کے جوہر کو مشتعل کر دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خودی کی مخفی صلاحیتیں ارتقا پذیر ہو جاتی ہیں اور ارتقائی اس کے استحکام کا باعث ہوتا ہے۔

از محبت اشتعال جوهرش  
ارتقائی ممکنات مضمرش  
سطور بالا میں لکھا جا چکا ہے کہ خودی کی فطرت کو عشق کے ساتھ ایک قسم کا تعلق ہے تو اس لئے ضروری ہے کہ عشق کی ماہیت بتائی جائے۔  
علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ عشق ایک لطیفہ نوری ہے۔ اس کی اصل مادی یا دنیادی نہیں ہے۔

اس لئے اس کو تیغ و خنجر کا خوف نہیں  
کیونکہ یہ چیزیں مادیات کو قطع کر سکتی ہیں نہ کہ 'نور' کو۔ عشق میں یہ طاقت ہے کہ اس کی ایک نگاہ غلط انداز سے سنگ خارا بھی شق ہو جاتا ہے۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق  
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بکندہ تصورات

تاشوی گوهر اگر باشی خرف  
تا عصائی لا الہ داری بدست  
هر طلسم خوف را خواہی شکست  
جب مال و دولت و حب وطن

جب خویش و اقربا و حب زن  
هر کہ در اقلیم لا آباد شد  
فارغ از بند و زن و او لادشد  
اهل قوت شو ز ورد یا قوی  
تا شوار اُشترِ خاکی شوی  
اگر مسلمان صدق دل سے اس بات پر  
ایمان لے آئے کہ خدا کے علاوہ اور کوئی طاقت  
اسے نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتی تو پھر دنیا میں وہ  
کسی طاقت سے مرعوب نہیں ہو سکتا۔

ان دونوں مدارج سے گزرنے کے بعد  
انسان اس درجہ پر فائز ہوگا جسے انسانیت کا  
اوج کمال سمجھنا چاہئے۔ یہ نیابت الہی کا درجہ  
ہے اور اسے حاصل کرنا ارتقائے خودی کا بلند  
ترین نصب العین ہے۔ اس کی تلاش میں نوع  
انسان ہزار ہا سال سے سرگرم سعی ہے اور اسی  
کے انتظار میں کائنات روز ازل سے بے قرار  
ہے۔

#### مرحلہ سوم: نیابت الہی

نائب حق در جہاں بودن خوش است  
هر عناصر حکمران بودن خوش است  
نائب حق ہم جو جان عالم است  
ہستی او ظل اسم اعظم است  
از رموز جز و کل آگہ بود  
در جہاں بود قائم با مر اللہ بود  
نوع انسان را بشیرد ہم نذیر  
ہم سپاہی ہم سپہ گر ہم امیر  
ذات او توجیہ ذات عالم است  
از جلال او نجات عالم است  
زندگی را می کند تفسیر نو  
می دهد این خواب راتعبیر نو

□□□

جون ۲۰۱۹ء تا اگست ۲۰۱۹ء



# نظیر اکبر آبادی کے عہد میں غزل کے موضوعات و مضامین

غزل نے اپنی تمام صلاحیتوں اور کمالات کی وجہ سے ہر زمانے کے ماحول اور رجحانات کے مطابق زبان و بیان کی سطح پر موضوعات و مضامین کا انتخاب کیا۔ غزل کی چمک دار حقیقت نے اس کو ہر زمانے میں زندہ اور توانا بنائے رکھا۔

وئی دکنی کی جو اسلوب و مضامین اور موضوعات ایرانی شاعری سے لائے تھے وہ اب نظیر کے دور میں پروان چڑھ کے اپنے اندر حیات انسانی کے جذبات و احساسات کو سمیٹنے کی صلاحیت پیدا کر چکے تھے۔ اردو غزلیہ شاعری کی سب سے اہم خصوصیت جو اس کے موضوعات و مضامین کے اعتبار سے ہے وہ یہ ہے کہ وہ بدلتے ہوئے حالات سے نظریں ملانے کی صلاحیت خود بخود پیدا کرتی ہے۔

نظیر اکبر آبادی کے دور میں جو غزلیہ شاعری پروان چڑھ رہی تھی وہ اب ایک وسیع معانی و مفاہیم کو اپنے دامن میں سمیٹ چکی تھی۔ اس دور میں جو موضوعات و مضامین غزلیہ شاعری کو موضوع سخن تھے وہ حسب ذیل ہیں۔

عشقیہ مضامین، عشق مجازی، عشق حقیقی، غمیریات کا بیان جس میں شراب معرفت، شراب حقیقت اور شراب مجازی ہے۔ آزادی روی تصوف جس میں بہت اہم مضامین تصوف اور اس کے انداز میں بیان ہوئے۔ نظیر کا عہد غزل کا عہد ذریں ہے اس وقت اصلی اور سچی شاعری اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ آسمان ادب پر جلوہ گر تھی جس میں جدت ادا، سادگی، شیرینی درد و اثر، لطافت، تخیل، سوز و گداز، تصنع اور صناعت، تہذیبی، غیر تہذیبی، سنجیدہ غیر سنجیدہ انداز بیان کے ساتھ نظم ہونے والے اشعار کی وافر مقدار پیش کی جاسکتی ہے۔

عشقیہ مضامین کی ترجمانی غزل میں تقریباً ہر دور میں ملتی ہے، جس میں انسانی فطرت، انسانی جذبات و احساسات اور نفسیات کی ترجمانی مشترک ہے۔ اس کے لازوال ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ ہر شخص کے جذباتی تقاضوں کو پورا کرتی ہے، اور ہر فرد اس میں اپنے جذبات و احساسات کی حقیقی تصویر دیکھنے میں کامیاب ہوتا ہے، ہماری اس بات کی وضاحت عبادت بریلوی کے اس قول سے ہو جائیگی:



ڈاکٹر ناہید رضوی

4/196

سیکٹر 4، جاگی پورم ایکسٹینشن  
لکھنؤ

رابطہ: 9935602391

”صنف غزل میں جن انفرادی کیفیات کی تصویر کشی ملتی ہے اس میں عشقیہ کیفیات کی بنیادی حیثیت ملتی ہے۔ غزل نے تنوع اور رنگارنگ عشقیہ کیفیات کو اپنے دامن میں جگہ دے کر ان جذباتی تقاضوں کو پورا کیا ہے جو کسی اور صنف ادب سے پورے نہیں ہو سکے۔ ان عشقیہ کیفیات میں آفاقیت ہے۔ میر، سودا، درد، نے جن عشقیہ کیفیات کو پیش کیا تھا وہ آج بھی ہمیں اپنی کیفیات معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی تقریر کی لذت دیکھیے کہ جو کچھ انھوں نے کہا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا یہ بھی ہمارے دل میں ہے:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا  
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے  
عشقیہ موضوعات پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا  
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا  
قافلے میں صبح کے اک شور ہے  
یعنی غافل ہم چلے سوتا ہے کیا  
سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمین  
تخم خواہش دل میں تو بوتھا ہے کیا  
یہ نشان عشق میں جاتے نہیں  
داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا  
غیرت یوسف ہے یہ وقت عزیز  
میر اس کو رانگاں کھوتا ہے کیا

چوری میں دل کی وہ ہنر کر گیا  
دیکھتے ہی آنکھوں میں گھر کر گیا

ہے عشق کا فسانہ یہاں زبان زد  
ہر شہر میں ہوتی ہے یہ داستان زبان دست

.....

اقرار میں کہاں ہے انکار کی سی خوبی  
ہوتا ہے شوق غالب اس کی نہیں نہیں پر

.....

محبت میں شاید کردی دل کو آگ  
دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف

.....

لیکن نظیر کے عہد میں غزل کے  
موضوعات صرف عشقیہ موضوعات تک ہی محدود  
نہ تھے۔ بلکہ غزل میں فلسفیانہ، عارفانہ اور  
اخلاقی مضامین بھی داخل ہو گئے تھے۔ اب  
غزل کا دامن اتنا وسیع ہو گیا تھا جتنی خود انسانی  
زندگی ہے۔

خریات کو بھی اس عہد میں غزل کا ایک  
اہم جز قرار دیا جاتا ہے۔ خریہ موضوعات کی  
غزل میں داخل ہونے کی کئی وجوہات ہیں عشق  
میں ہوش و خرد اور فکر و دانش کا عمل کم ہو گیا ہے  
وہ اپنے حال میں ہی مست ہے اور ہر طرح  
کے سود و زیاں سے بالاتر ہے اس طرح عشق  
اور شراب ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں  
اور کئی مرتبہ ان دونوں کو ایک ہی معنی میں  
استعمال کیا گیا ہے۔

شراب اردو شاعری میں دو طریقے  
سے استعمال کی گئی ہے ایک تو شراب معرفت  
کے طور پر اور دوسری حقیقت نظروں سے  
دیکھتے اور سمجھتے ہیں کچھ شعرا کا خیال یہ تھا کہ مہ  
نوشی کا مقصد لذت یا فرحت حاصل کرنا نہیں  
ہے بلکہ دیر و حرم اور کفر و ایمان کے جھگڑوں  
سے الگ رہنے کیلئے مہ نوشی کرنا ضروری ہے

تاکہ کیفیت و مستی میں ڈوب کر اس گناہ سے  
بچا جاسکے۔

نظیر کے عہد میں جن شعراء کے یہاں  
خریات کے متعلق اشعار پائے جاتے ہیں ان  
میں اہم ترین نام سودا اور میر ہیں۔ خریات سے  
متعلق کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

.....

ساقی نے سب کو بھر کے دئے جام بزم میں  
ساغر جو ہم نے مانگا تو شیشہ ہلا دیا

.....

میں بھی ہے مینا بھی ہے ساغر بھی ہے ساقی نہیں  
دل میں آتا ہے لگا دیں آگ میخانے کو ہم

.....

دور سے آئے تھے ساقی سن کے میخانے کو ہم  
بس ترستے ہی چلے افسوس پیمانے کو ہم

.....

تفرقہ ہوتا ہے ایسا بھی گل اندام کہیں  
مے کہیں شیشہ کہیں ساقی کہیں جام کہیں

.....

مے ہوئی خون دل سراہی میں  
جام مے دیدہ پر آب ہوا  
خریات کے علاوہ نظیر کے عہد میں غزل  
کے موضوعات و مضامین تھے۔ اس میں ایک  
اہم ترین موضوع آزادہ روی بھی ہے۔ اس مو  
ضوع کے تحت شعرا کفر و ایمان، دیر و حرم، کعبہ  
کلیسہ کے قید و بند سے آزاد ہو کر زندگی گزارتے  
ہیں۔ اس کے تحت اردو غزل میں جو روایات  
آئیں اس میں وافر مقدار میں اشعار ملتے ہیں۔  
جس میں آزادی کے رجحان کو پروان  
چڑھایا گیا ہے۔ تصوف نے ہر طرح کی  
پابندیوں کو توڑا۔ اس کا مقصد تھا کہ دل صاف سچا  
اور ریا کاری سے پاک ہونا چاہیے جہاں حسد،

نفرت، نمائش کے نام و نشان نہ ہو۔ اسی وجہ سے جو شاعری تصوف کے راستے سے اردو غزل میں آئی وہ آزاد روی کی شاعری کہلائی۔ اس کی مثال مندرجہ ذیل اشعار میں پیش کئے جاسکتے ہیں:

بیٹھو ہو میر ہو کے در کعبہ پر فقیر  
اس رومیہ کے باب میں بھی کچھ دعا کرو

.....

میرے کعبہ سے قصد دیر کیا  
جاؤ پیارے بھلا خدا ہمراہ

.....

نظیر کے عہد میں تصوف ایک اہم درجہ رکھتا ہے کہ اس نے موضوعات کا تنوع اور خیالات کی رنگارنگی پیدا کرتے ہوئے اس کو گہرائی اور سنجیدگی سے واقف کرایا۔ اور اس صنف غزل میں تصوف کی ایک عظیم اور اہم روایت قائم ہوئی۔ اس بعض شعراء کے مطابق جب تصوف اور اس کے مختلف مسائل اس کا جز بن جاتے ہیں تبھی غزل ترقی کی منزلوں کو طے کرتی ہے۔ ان مسائل کی ترجمانی کے سبب اس میں نئی زندگی وجود میں آئی ہے۔ جس کی وجہ سے جس کے سہارے سے دلوں میں نئی امگوں کے چراغ روشن ہوتے ہیں۔ تصوف کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

دیرو حرم سے گزرے اب دل سے گھر ہمارا  
ہے ختم اس آبلے پر سیر و سفر ہمارا

.....

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیرو حرم کی راہ چل  
یہ اب دعویٰ حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

.....

مدرسہ یا دیر تھا کعبہ یا بت خانہ تھا  
ہم سبھی مہمان تھے واں تو ہی صاحب خانہ تھا

محولہ بالا موضوعات نظیر کی بھی غزلیہ شاعری میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ میر، سودا، درد، جو نظیر کے ہم عصر ہیں ان شعراء کے یہاں بھی یہ مضامین بہت نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ شاعر کا موضوع اس کی شخصیت فکر، شعور کا آئینہ ہوتا ہے۔ بہت سے شعراء کے یہاں ان کا شعور موجود نہیں تھا۔ اور جن شعراء کو ان کا گہرا شعور حاصل تھا انہوں نے اس کی حقیقی ترجمانی کی ہے۔ میر کو اپنے دور کے سماجی سیاسی حالات سے اس کے اتار چڑھاؤ سے دلچسپی تھی۔ اس لئے انہوں نے حالات کو اپنی خود نوشت میں پیش کیا ہے۔ گہرے تاثر کے زیر اثر حالات کی ترجمانی تو میر کی غزلوں میں موجود ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ غزلوں میں ان حالات کی ترجمانی ان کے مزاج کے خلاف تھی۔ میر کی غزلوں کے اشعار اس خیال کو صحیح ثابت کرنے میں مدد کرتے ہیں۔

ہر صبح مرے سر پر قیامت گزری  
ہر شام نئی ایک مصیبت گزری

.....

پامال کدورت ہی رہا یاں دن رات  
یوں خاک میں ملتے ہم کو مدت گزری  
ان اشعار کے ذریعہ یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ میر کو اس عہد کے سماجی اور سیاسی نظام اور اس کے زیر اثر پرورش پانے والی ایک تہذیب اور ایک معاشرت سے لگاؤ تھا۔ میر کو ان تمام چیزوں سے لگاؤ ہونے کی وجہ سے وہ ان کو اپنی غزلوں میں پیش کرتے ہیں۔

اس صورت حال کی بناء پر انہیں زندگی میں موت کی حکمرانی دکھائی دیتی ہے۔ وہ موت کو

زندگی کی حقیقت کے رنگ میں تسلیم کرتے تھے۔ اور ان کی اس حقیقت کا اظہار ان کی غزلوں میں سیاسی اور سماجی حالات کی ترجمانی کا حصہ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کہا میں نے کتنا ہے گل کاشات  
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

.....

گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگ دلی سے میرے  
بل بل پکاری دیکھ کے صاحب پر پرے

.....

تسکین درد مندوں کو یارب شتاب دے  
دل کو ہمارے چین دے آنکھوں کو خواب دے  
سودا کے یہاں کسی حد تک بدلاؤ ہے اس میں سوز و گداز اور اداسی نہیں ملتی بلکہ مسرت اور شادمانی کا احساس پایا جاتا ہے۔ درد تصوف کے اہم شاعر مانے جاتے ہیں۔ تصوف کی منزل خاص طور سے بہت مشکل ہے۔ لیکن درد کا یہ اعجاز ہے کہ انہوں نے کم سے کم اصطلاحات استعمال کئے بغیر بڑی سے بڑی حقیقت کو بیان کر دیا ہے۔ ان کے یہاں تقریباً سارے موضوعات و مضامین جلوہ گر ہیں۔ میر کی شاعری کی موضوعات و مضامین تھے۔ یہاں سودا اور درد کے کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں جس سے نظیر کے عہد کی غزلیہ شاعری کے موضوعات و مضامین کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

دل بھی تیرے ہی ڈھنگ سیکھا ہے  
آں میں کچھ ہے آں میں کچھ ہے

.....

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا  
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

□□□

# امیر خسرو کے نگہ دار و ممدوح سلطان، وزیر اور صوبے دار

۱۴ ویں صدی کے شاعر، مفکر اور عظیم سیاستداں

ابوالحسن امیریمین الدین محمود خسرو (1325-1253) کے سلاطین، وزراء اور صوبے داروں سے تعلقات کا منظر نامہ

امیر خسرو بہت بڑے سیاست داں، اعلیٰ درجے کے مورخ، قلم کار اور سپاہی تھے۔ ان کی شخصیت ہمہ گیر (Versatile) تھی۔ وہ صرف نابغہ (Genius) نہیں بلکہ مافوق النابغہ (Super Genius) تھے۔ وہ ایک ایسے فن کار تھے جنہوں نے ایک ساتھ کئی شعبہ ہائے فن میں یکساں کمال دکھایا ہے بلکہ وہ فن کار سے زیادہ ایک صنّاع تھے (2)۔ ان کی تحریروں سے ہمیں سلطنت دور کی سماجی معاشرتی اور اقتصادی صورت حال کا خوب بہتر پتہ چلتا ہے۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے ”ان کی نظم و نثر سیاسی اور سماجی تاریخ کا ایک مستند ذخیرہ ثابت ہوئی (3)۔“ ان کی فارسی شاعری جہاں ہمیں ایرانی تہذیب و تمدن کی سیر کراتی ہے وہیں ہندو شاعری ہمیں ہندوستان کے عام عوام اور نچلے طبقے کے لوگوں کے معاشرتی رجحانات کا پتہ دیتی ہے۔ حکمران طبقہ اور ان کے متوسلین کی زبان فارسی اور ترکی تھی مگر ترکی اور فارسی کے میل جول سے جو زبان تیار ہو رہی تھی اسے خسرو نے ہندو کہا۔ اسی ہندو کی کوہلی، اودھ، ملتان، سامانا اور لاہور کے بازاروں میں نان بائی، قیمہ فروش، سبزی فروش، زرگر، آہنگر اور گداگر بول رہے تھے۔ خسرو کا صرف صوفیوں قلندروں اور علماء سے ہی نہیں بلکہ سماج کے نچلے طبقے میں رہنے والے افراد سے بھی تعلقات تھے۔ وہ خوش باش زندہ دل اور آزاد انسان تھے۔ وہ صرف عشق حقیقی میں ہی نہیں بلکہ عشق مجازی میں بھی مہارت رکھتے تھے اور عموماً عشق و محبت کے مزے لیتے رہتے تھے (4)۔ چاہے مے خانہ ہو یا خانقاہ ان کی پہنچ ہر جگہ تھی (5)۔ یہ جان کر حیرانی ہوتی ہے کہ خسرو ایک ساتھ دو نقطوں پر رہنے والے افراد سے یکساں تعلقات بنائے رکھ سکتے تھے۔ ان کی ذہنی صلاحیت اتنی پائدار تھی کہ وہ متضاد شخصیات کے لئے کبھی پریشانی کا باعث نہیں بنے۔ وہ متواتر ایک دوسرے کے مخالف ذہن اور سوچ رکھنے والے سلاطین، وزراء اور صوبے داروں کے ساتھ نہ صرف رہ لیتے تھے بلکہ وہ ان کی شخصیت میں دخیل بھی ہوتے تھے۔ یوں کہا جائے تو درست ہوگا کہ ”ان کی فطرت میں غیر معمولی قسم کی چلک تھی (6)۔“ ہندوستان کی دھرتی کے لئے ناممکن ہے کہ پھر کوئی امیر خسرو پیدا ہو۔



ڈاکٹر ذاکر حسین

شناختی نگر وارڈ، وارڈ نمبر ۷  
نزدست پشپا اسکول، دہلی  
رابطہ: 6394171473

ہم دیکھتے ہیں کہ سلطان جلال الدین خلجی کا بھتیجا اور داماد علاء الدین نے انہیں سرعام چاقو گھونپ دیا اور اقتدار پر قابض ہو گیا۔ خسرو نے اپنے اتنے بڑے ممدوح اور نگہ دار کی موت پر اف تک نہیں کی۔ جیسے ہی علاء الدین کڑا مانک پور سے دلی پہنچا خسرو اس کی شان میں قصیدہ لے کر دربار میں حاضر ہو گئے۔ یہاں خسرو کے دماغ نے اتنی سرعت سے کام کیا کہ عام آدمی اس کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ خسرو دیکھ رہے تھے کہ جتنے لوگوں نے جلال الدین کی موت پر سر میں جنبش کی ان کے جسموں نے ان کے سروں کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا۔ جو تذبذب کے شکار تھے اور علاء الدین کو تخت کی مضبوطی میں ان کی ضرورت تھی ان کا منہ سونے چاندی کے سکوں سے بھر دیا گیا اور جنہوں نے مخالفت کی ان کے سروں کو اڑا دیا گیا (7)۔ خسرو ان دونوں طرح کے افراد میں شامل نہیں تھے۔ کیونکہ آنے والے حالات نے ظاہر کر دیا کہ علاء الدین نے خسرو کو سزا دی اور نہ ہی انہیں انعامات سے نوازا۔ قطب الدین مبارک شاہ کے ساتھ بھی خسرو کا رویہ بہت دلچسپ تھا۔ تخت نشین ہوتے ہی مبارک شاہ نے خسرو کے دوست اور یار غار (8) شیخ نظام الدین اولیا کے خلاف سازشیں شروع کر دیا۔ شیخ کے ساتھ اس کی دشمنی انتہا کو پہنچ گئی مگر خسرو کے جتنے اچھے تعلقات مبارک شاہ تھے اتنے ہی اچھے تعلقات شیخ سے تھے۔ وہ روزانہ دربار میں جاتے اور شام کو شیخ کی خدمت میں بھی حاضری دیتے۔ کیا ایسا اس لئے بھی ممکن ہوا کہ وہ بہت بڑے اداکار تھے اور اپنے چہرے کی رنگت اور خوشی و غم کی کیفیات کو پلک جھپکتے میں تبدیل کر لیا

کرتے تھے (9)۔ وہ اپنے جذبات پر بھی قابو رکھنے کی مہارت رکھتے تھے۔ جذبات پر بے انتہا کنٹرول کی وجہ سے ہی وہ درباری سازشوں اور تخت و تاج کی تبدیلی کے وقت چہرے پر خوشی و غم کے تاثر کو روکنے میں کامیاب ہو سکے۔ ”ڈوبتے سورج کی طرف پیٹھ کرنا اور اگتے سورج کی عبادت کرنا اگر کسی کو آتا تھا تو وہ صرف خسرو تھا (10)۔“ محمد مجیب خسرو کے اس رویے سے بہت مایوس نظر آتے ہیں۔ ”خسرو جس بے تکلفی سے وقت کے ساتھ بدل جاتے تھے تو ایسے شخص کی شاعری میں خلوص کا عنصر تو نمایا ہو ہی نہیں سکتا“ (11)۔ کیا یہ ایک عام آدمی کے لئے آسان ہے۔ مگر خسرو عام آدمی نہیں تھے وہ نابغہ تھے۔ ان کے اندر بے پناہ خود بینی اور خود اعتمادی تھی جب وہ بادشاہ وقت کی تعریف کرتے تو یہ نہیں سوچتے کہ ٹھیک انہیں الفاظ، استعارات اور تشبیہات کا استعمال کر کے چند دن قبل موجودہ بادشاہ کے قاتل کی بھی تعریف کر چکے ہیں۔

ہم اس مضمون میں کسی بھی اسٹج پر امیر خسرو کی نگہ داری کرنے والے ان کے ممدوح سلاطین، وزراء اور صوبے داروں سے ان کے تعلقات کا مطالعہ کریں گے۔ اور یہ دیکھیں گے کہ جن کے وہ بے حد قریب رہے اور انعامات و اکرام حاصل کیا ان کے زوال کے وقت ان کا رویہ کیا تھا (12)۔ 1277ء جب سے خسرو نے اپنی درباری زندگی کی شروعات کی اور ان کی وفات 1325ء سے قبل ایک دو معاملے کو چھوڑ دیا جائے تو کسی نے ان کی وفاداری اور ان کے کام کرنے کے طور طریقوں پر شک نہیں کیا۔

## 1۔ ملک علاء الدین محمد کشلی خاں عرف ملک چچو (1277-78)

جب خسرو کے نانا عماد الملک کا انتقال ہوا ان کی عمر 20 سال تھی۔ ایک ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر کو اپنی شناخت قائم کرنے اور روزگار کے حصول کے لئے کسی نگہ دار و ممدوح کی ضرورت تھی۔ اس وقت تک وہ دلی میں مشہور ہو چکے مگر وہ کسی کی مصاحبی کر کے اپنا نام روشن کرنا چاہتے تھے۔ اسی تلاش میں انہیں کشلی خاں کا سہارا ملا۔ بات 1277ء کی ہے جب وہ پہلی بار غیاث الدین بلبن کے بھتیجے اور امیر حاجب کے عہدے پر سرفراز چچو خاں کی مصاحبی میں آئے۔ وہ کول (علی گڑھ) کا جاگیردار تھا۔ وہ ایک اچھے شوٹر ہونے کی وجہ سے ایک اچھا شکاری تو تھا ہی پولو کا بہت شاندار کھلاڑی بھی تھا (13)۔ وہ نہایت دریا دل تھا۔ اس کی دریا دلی کے متعلق کئی کہانیاں مشہور ہیں۔ وہ اپنی شان میں اونچی آواز میں قصیدہ پڑھنے والوں کو اپنی ساری جائداد دے دیا کرتا تھا۔ ایک بار ایک شاعر خواجہ شام معین کو ایک شاندار قصیدہ کے عوض اس نے اپنے اصطل کے سارے گھوڑے دے دئے تھے (14)۔ انتہائی کنجوس کے لئے مشہور بلبن اس کی دریا دلی پر اکثر خفا رہتا تھا۔ سچ پوچھئے تو خسرو کو ایسے ہی رحم دل آدمی کی ضرورت تھی۔ خسرو ملک چچو کی شام کی شراب و کباب کی محفلوں کو آراستہ کرتے اور ان محفلوں میں جان پھونکنے کے لئے شعروں اور لطیفوں کی پھلجھڑیا چھوڑتے (15)۔ انہوں نے اس کی شان میں اپنی تمام تر لفظی خزانے کی طاقت کا استعمال کرتے ہوئے کئی قصیدے لکھے۔ غرۃ الکمال کے دیباچے میں خسرو نے قبول کیا ہے



ان کے اکثر قصیدے ملک کی تعریف میں لکھے گئے (16)۔ اس کے ایک قصیدے کے چند اشعار بہت مشہور ہوئے۔

صبح چوں از سوئے مشرق رو نمود  
صبح منینا روضۂ مینو نمود  
گیسوئے شب شد سپید و آفتاب  
نور سیمیں از تہ گیسو نمود  
جام آئینہ است لیکن بے شراب  
مرد ماں را کے تواند رو نمود  
بود پنہاں آفتاب آن دم کہ صبح  
ہمدمی با باد عنبر بو نمود  
صبح را گفتم کہ خورشیدت کجاست  
آسمان روئے ملک چہ جو نمود (17)

(صبح جب مشرق سے نمودار ہوئی اور چاروں طرف روشنی پھیل گئی تو ایسا ظاہر ہوا جیسے سورج معشوق کی زلفوں کے نیچے سے نکل رہا ہو۔ زرد کرونوں کی چمک نے رات کی تاریکی کو ختم کر دیا اور چاند لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اپنے درد دل کو کسی امیر کے سامنے ظاہر نہیں کرنا چاہئے جیسے خالی پیالے کو کوئی جگہ نہیں دیتا۔ ایسے میں میں نے صبح سے پوچھا کہ تمہارا سورج کہاں ہے تو کرونوں کے اندر سے ملک چھجو کا چہرہ نمودار ہو گیا۔)

ملک چھجو کے یہاں خسرو دو سال ہی نوکری کرنے پائے تھے کہ ایک واقعے نے ملک کو خسرو سے بدظن کر دیا۔ ایک دن اس کی محفل میں خسرو اپنا کلام پیش کر رہے تھے وہاں غیاث الدین بلبن کا ہونہار بیٹا ناصر الدین بغرا خاں بھی موجود تھا۔ انعام و اکرام کے دور میں اس نے بھی خسرو کو انعام دیا جسے نہ چاہتے ہوئے بھی خسرو نے قبول کر لیا اس بات نے ملک کے دل میں

ایسی گانٹھ ڈال دی کہ اسے انتہائی کوششوں کے بعد بھی خسرو رفع نہیں کر سکے اور انہیں اس کی نوکری سے ہاتھ دھونا پڑا۔ ”غرۃ الکمال کے دیباچے میں خسرو ملک کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ مجھے سزا دینا چاہتا تھا اور اپنے غصہ کے تیر کا نشانہ بنانے کا ارادہ رکھتا تھا اس لئے میں بھی تیر کی طرح بھاگ نکلا (18)۔“

## 2۔ ناصر الدین بغرا خاں (1279)

ملک چھجو کے یہاں سے آنے کے بعد خسرو نے بغرا خاں کے یہاں نوکری کر لی۔ 26 سالہ خسرو نے اس واقعے سے بہت کچھ سیکھا۔ یہ ان کی زندگی کا پہلا واقعہ تھا جس نے انہیں ناکام کیا۔ آنے والی زندگی میں انہوں نے اس کا پورا خیال رکھا۔ بغرا خاں سانا چھاؤنی کا افسر ہوا کرتا تھا۔ اسی دوران سلطان بلبن نے لکھنؤ (یہ لکھنؤ نہیں ہے بلکہ موجودہ مرشد آباد کا پرانا نام ہے۔ لکھنؤ ان دنوں صوبہ بنگال کا صدر مقام ہوا کرتا تھا (19)) پر حملہ کر دیا۔ بلبن کے حکم کے مطابق بغرا خاں سانا چھاؤنی کی فوج کے ساتھ بنگالے کی طرف بڑھا۔ اس مہم میں خسرو بھی بغرا خاں کے ساتھ تھے۔ بنگال فتح کرنے کے بعد بلبن نے بغرا کو وہاں کا صوبے دار بنا دیا۔ خسرو کو بنگالے کی آب و ہوا پسند نہیں تھی مگر انہیں وہاں رہنا پڑا۔ آخر کار انہوں نے بغرا کی بہت تعریف کر کے دلی آنے کی اجازت حاصل کر لی۔

## 3۔ سلطان محمد (1280-85)

بنگالے سے واپسی پر خسرو نے شہزادہ سلطان محمد کو جوآن کیا۔ شہزادہ محمد بلبن کا دوسرا بیٹا تھا۔ وہ انتہائی بہادر اور عالم تھا۔ وہ خود بھی شعر کہتا تھا اور شاعروں اور صوفیوں کے درمیان گھرا

رہتا تھا۔ خسرو کو یہ ماحول خوب پسند آیا۔ انہوں نے اس کی تعریف میں 23 قصیدے لکھے۔ اتنے قصیدے انہوں نے اب تک کسی مدوح کے لئے نہیں لکھے تھے (20)۔ مکش بہ گرد رخ از خط دلبر با پردہ کہ کس ز شب نہ کند آفتاب را پردہ زبیم آن کہ رسد چشم آفتاب بہ تو بہ بند و ابر بھر لحظہ در ہوا پردہ کند بہ پیش خطت پردہ پوشی سبزہ چو گل بہ باغ کشد بر سر گیا پردہ نسیم خلق تو روزی خلق را چوں گل کشاد از پس ہر پردہ جدا پردہ (21) (رات اپنی تاریکی میں سورج کو ڈھک لیتی ہے۔ اس خوف سے کہ سورج کی روشنی معشوق کے چہرے کو روشن کر دے گی۔ تم اس کے چہرے پر پردہ نہ ڈالو۔ بادل تھوڑی دیر کے لئے ہی سورج کو ڈھک سکتا ہے۔ جس طرح چڑیا باغ میں خوش ہوتی ہے اور ہری گھاس میں چھپ جاتی ہے۔ اس طرح سلطان کے اخلاق کی خوشبو لوگوں کے رزق کے لئے پھول جیسا ہے۔)

مگر خسرو کی قسمت میں بہت دنوں تک یہ آرام نہیں لکھا تھا۔ منگولوں کے حملے کو روکنے کے لئے سلطان بلبن نے شہزادہ محمد کو ملتان بھیج دیا۔ خسرو بھی اس کے ساتھ تھے۔ شہزادہ نے ملتان میں دربار آراستہ کیا۔ چند ہی سالوں میں ملتان میں بھی صوفیوں اور شاعروں کا مجمع لگ گیا۔ 1285 میں منگولوں کے ایک حملہ میں شہزادہ محمد مارا گیا اور خسرو منگولوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ انہوں نے غرۃ الکمال میں اس واقعے کا موثر انداز میں ذکر کیا

ہے (22)۔ ایک منگول سپاہی انہیں بنگا کر کے گلے میں رسی ڈال کر گھسیٹتے ہوئے لے جا رہا تھا۔ شدید گرمی کے موسم میں جب خسرو کو خوب پیاس لگی تھی۔ منگول سپاہی اور اس کا گھوڑا بھی پیاس سے بدحال تھے۔ دریائے راوی کے کنارے منگول سپاہی اور اس کے گھوڑے نے خسرو کو نظر انداز کرتے ہوئے ڈٹ کر پانی پیا اور وہیں ڈھیر ہو گئے۔ خسرو کہتے ہیں کہ ایک عقل مند شخص کی طرح انہوں نے صرف اپنے ہونٹ گیلے کئے اور موقع کی نزاکت دیکھ کر وہاں سے بھاگ نکلے (23)۔ جان بچی لاکھوں پائے کے مصداق انہوں نے دلی پہنچ کر ہی دم لیا۔ انہوں نے اس واقعے پر اپنا شہرہ آفاق مرثیہ غرۃ الکمال لکھا جو دلی میں بہت مشہور ہوا۔ لوگ اسے پڑھتے اور اپنا سر دھنتے تھے۔ منگولوں کے حملے میں اپنا عزیز ترین بیٹا کھونے کے غم میں سلطان بلبن اتنا غم زدہ ہوا کہ اس نے دنیا ترک کر دیا اور بیمار رہنے لگا۔ بہت جلد اس کی موت ہو گئی۔ بلبن کی موت کے بعد دلی میں ایک بار پھر اقتدار کی جنگ شروع ہو گئی۔ اس بار جن لوگوں نے اقتدار پر قبضہ کیا وہ خسرو کے لئے مشکلات کھڑی کر رہے تھے جس سے پریشان ہو کر وہ اپنی ماں کے ساتھ پٹیلی چلے گئے۔

#### 4۔ امیر علی سر جاندار عرف حاتم خاں (1285)

امیر علی سر جاندار کو خان جہاں (24) بھی کہتے ہیں۔ دلی سے پٹیلی آنے کے بعد خسرو اودھ کے صوبے دار خان جہاں کے ساتھ رہنے لگے۔ خان جہاں بہت دریا دل اور سخی تھا۔ اسی نسبت سے اسے لوگ حاتم خاں کہتے تھے۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ غریبوں کو کبھی

تانبے کا سکہ جیتل نہیں بلکہ سونے چاندی کا ہی سکہ دیتا تھا۔ ”میں نے حاتم خاں کے ہاتھوں کے سایہ ابر میں پناہ لی۔ اس نے اپنے کف دریا موج سے مجھ کو طشت بھر بھر کراتے روپے دئے کہ اگر میں اس دولت کو محفوظ رکھتا تو میرے اہل و عیال تمام عمر عزت و آبرو کے ساتھ بسر کرتے (25)“ خسرو اس کی تعریف میں ایک قصیدہ میں کہتے ہیں۔ ”میں نے سمندر سے کہا کہ تو بخشش میں خان کے ہاتھوں کی طرح ہے۔ وہ لرز گیا اور کہنے لگا، میرا یہ مقام نہیں ہے۔ بخشش کے وقت صرف خس و خاشاک بکھیرتا ہوں بخشش کے وقت موتی اور یاقوت حاتم خاں کے ہاتھ میں ہوتے ہیں (26)۔“ خان جہاں خسرو کو بہت چاہتا تھا مگر خسرو کا دل اس کے پاس نہیں لگا۔ انہیں دلی کی یاد آنے لگی۔ ان دنوں دلی کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ پھر بھی وہ اودھ چھوڑ دلی آ گئے۔

#### 5۔ معزالدین کیتباد (1287)

کیتباد بغرا خاں کا بیٹا تھا۔ جب وہ تخت پر بیٹھا اس کی عمر 18 سال رہی ہوگی۔ غیاث الدین بلبن تو چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا بغرا خاں ہی اس کے بعد تخت پر بیٹھے۔ بلبن نے بغرا خاں کو بنگالے سے بلا کر بہت سمجھایا مگر تاریخ کا حصہ بنا اس کی قسمت میں نہیں تھا۔ اسے اودھ اور بنگالہ کی سرزمین اتنی پیاری لگی کہ اس نے بلبن کی خواہش کو درکنار کرتے ہوئے چپکے سے دلی چھوڑ دیا۔ اپنی موت سے چند روز قبل بلبن نے سلطان محمد کے بیٹے کینسر کو ملتان سے واپس بلا کر دلی کے تخت پر بٹھانے کی وصیت کی۔ مگر اس کی موت کے بعد اس کی وصیت کو درکنار کرتے ہوئے کچھ لوگوں نے خود اقتدار پر پلس پردہ

قابض رہنے کے لئے کیتباد کو محل سے نکال کر سلطان بنا دیا اور کینسر کو ملتان میں ہی روک دیا۔ دلی میں جب یہ ڈرامہ چل رہا تھا خسرو نے دلی چھوڑ دیا تھا اور اودھ کے صوبے دار امیر علی سر جاندار کے یہاں رہے۔ خسرو کے اودھ سے دلی پہنچنے کے دو دن بعد ہی سلطان معزالدین کیتباد کی طرف سے انہیں فوراً دربار میں حاضر ہونے کا حکم موصول ہوا۔ بغیر دیر کئے خسرو نے نوجوان سلطان کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا، اور دربار میں پہنچ گئے۔

بادا جہاں ہمیشہ بہ کام تو شہریار  
شاہان روزگار غلام تو شہریار  
خسرو زجام جود تو سیراب مے کہ ہست  
امیدوار جرعۂ جام تو شہریار  
بادا ہمیشہ سکۂ تو چوں درم  
درست بر روئے سکۂ خطبہ بنام تو شہریار (۲۷)

(اے بادشاہ آپ کام ہمیشہ عظیم ہوتا ہے میری خواہش ہے کہ دنیا بھر کے بادشاہ آپ کے ماتحت ہو جائیں۔ میں آپ کی سخاوت کے جام سے سیراب ہوں۔ اور ہر وقت آپ کی عنایات کا طلب گار رہتا ہوں۔ آپ کا سکہ درہم سے زیادہ بیش قیمت ہے۔ اس سکے پر عظیم شہنشاہ کے نام کا خطبہ درج ہونا چاہئے۔)

سلطان کیتباد نے امیر خسرو کو بغرا خاں اور اپنے درمیان ہوئی جنگ اور صلح کے واقعے کو بہت شاندار طریقے سے لکھنے کا حکم دیا۔ اس نے یہ بھی وعدہ کیا کہ اسے اتنا سونا دیا جائے گا کہ زندگی میں کسی دوسری چیز کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ اس واقعے پر خسرو کی مشہور مثنوی ”قران السعیدین“ وجود میں آئی۔ سلطان کیتباد نے خسرو کو ڈھیروں سونا تو نہیں ہاں ”ملک

الشعراء“ کا خطاب ضرور دے دیا۔ خالی خالی ملک الشعراء کا خطاب لے کر خسرو ناراض تو بہت ہوئے مگر وہ فردوسی کے حال سے واقف تھے مسکراتے ہوئے گھر چلے آئے۔ یہاں شاہ وقت کا ہم نوار بننے والا ان کا نظریہ کارگر ثابت ہوا۔

#### 6۔ جلال الدین خلجی (1290-96)

سلطان جلال الدین 1290 میں دلی کے تخت پر بیٹھا۔ طویل عرصے کے بعد امیر خسرو کو جلال الدین کے طور پر ایک سایہ دار درخت ملا۔ سلطان جلال الدین خسرو سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ اس نے خسرو کو 1200 تنکے سالانہ وظیفہ، خلعت فاخرہ، سفید کمر بند اور ان کے والد امیر لاجن کا عہدہ بھی عطا کیا۔ خسرو کو دیا جانے والا یہ بہت بڑا عہدہ تھا۔ جلال الدین کے دور حکمرانی میں خسرو دربار کے اعلیٰ ترین عہدے پر پہنچ گئے تھے۔ سلطان جلال الدین خود ایک شاعر تھا اور رنگین غزلیں لکھتا تھا۔ ایک غزل کے چند اشعار اس کے مزاج کا پتہ دیتے ہیں۔

آں زلف پریشانت زولیدہ نمی خواہم  
وآں روئے چون گلنارت تفسیدہ نمی خواہم  
بے پیرمنت خواہم یکشب بکنار آئی  
ہاں بانگ بلند است این پوشیدہ نمی خواہم (28)

(تیرے بکھرے ہوئے زلفوں کو میں مزید الجھانا نہیں چاہتا اور میں تمہارے پھول جیسے چہرے کو مر جھایا ہوا بھی نہیں دیکھ سکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بغیر کسی سفارش کے ایک رات میرے گھر آؤ مگر تمہاری آواز اتنی بلند ہے کہ میں تمہیں پوشیدہ نہیں رکھ پاؤں گا۔)

جلال الدین بہت اچھے شعر نہیں کہتا تھا مگر اچھی شاعری کی پہچان اور پرکھ کرنے کی اس کے اندر خدا داد صلاحیت موجود تھی (29)۔ اس

کے دربار میں اس دور کے اعلیٰ درجے کے شاعر، موسیقی کار، گلوکار اور رقاصائیں موجود تھے۔ اس کی تنہائی کی محفلیں بہت ہی رنگین ہوا کرتی تھیں۔ شراب کا دور چلتا تھا۔ لطیفہ گوئی ہوتی تھی۔ ان محفلوں میں گائے جانے کے لئے خاص طور سے خسرو عشقیہ غزلیں لکھتے تھے۔ رقاصائیں جب ان کی غزلیں پیش کرتیں تو وہاں موجود بے قرار دلوں کو جنت کی سیر کا احساس ہوتا (30)۔ جلال الدین کی رنگارنگ محفلوں کے لئے عشقیہ غزلیں لکھنے کے علاوہ خسرو نے اس کے لئے ایک قصیدہ مفتاح الفتوح بھی لکھا جس میں انہوں نے اس کی جنگوں کا ذکر کیا ہے۔ اس قصیدے میں خسرو نے جلال الدین کے ان جنگوں کا بھی ذکر کیا ہے جو ملک چھجو اور خان جہاں کے ساتھ ہوئی ہیں۔ خسرو نے ملک چھجو اور خان جہاں پر جلال الدین کی فتح پر اسے مبارک باد دی ہے۔ خسرو نے صرف جلال الدین کو مبارکباد ہی نہیں دی بلکہ ملک چھجو اور خان جہاں کو ہتک آمیز الفاظ سے بھی یاد کیا۔

ہمہ کردند بھر بندگی جہد  
مگر میر کڑہ چھجوئی بد عہد (31)

(سلطان نے چھجو کو کڑہ کا امیر بنایا مگر اس نے وفاداری اور خدمت کے بجائے دھوکہ دیا)

یہاں غور کرنے والی بات یہ ہے کہ یہی ملک چھجو اور خان جہاں کبھی خسرو کے نگہ دار اور مدوح ہوا کرتے تھے اور ان کی تعریف میں خسرو نے اپنی جوانی کے بہترین قصیدے اور نظمیں لکھی تھیں اور انعام و اکرام حاصل کیا تھا۔

7۔ علاؤ الدین خلجی (1296-1316)

علاؤ الدین خلجی کا نام علی گرشا سپ (Ali Gurshasp) تھا (32)۔ اس نے

اپنے چچا اور خسرو کے سب سے بڑے محسن جلال الدین خلجی کا بے رحمانہ قتل کر کے دلی کے تخت پر قبضہ کیا اور علاؤ الدین خلجی کا لقب اختیار کیا۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ قتل اس وقت مزید دردناک ہو جاتا ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جلال الدین نے اپنے بھتیجے کی پرورش اپنے بیٹے کی طرح کی تھی اور اپنی بیٹی کی شادی بھی اپنے قاتل بھتیجے سے کی تھی۔ عالمی تاریخ میں اقتدار کے لئے اس طرح کے بے رحمانہ قتل کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ سب سے زیادہ حیرانی اس وقت ہوتی ہے جب خسرو اپنے مربی اور مدوح کے قتل کی مخالفت میں ایک لفظ کہے بغیر علاؤ الدین خلجی کی شان میں ایک قصیدہ لکھا، اور دربار میں پہنچ گئے۔ یہی نہیں کہ خسرو نے جلال الدین خلجی کے قتل پر تعزیت نہیں کی بلکہ جب جلال الدین خلجی کے خاندان کا صفایا کیا جا رہا تھا تو انہوں نے جلال الدین کے بیٹے ارکلی خاں کو انتہائی نازیبا الفاظ سے یاد کیا۔ ”جب شاہی فوجیں ملتان پر حملہ آور ہوئیں تو ارکلی خاں ایک چیونٹی کی طرح قلعے کی دیوار میں چھپ گیا (33)۔“

یہ وہ باتیں ہیں جو خسرو کی عظمت کو داغدار کرتی ہیں (34)۔ یقیناً خسرو عظیم شاعر ہیں مگر وہ اچھے انسان نظر آتے ہیں اور نہ ہی صوفی۔ تاریخ گواہ ہے کہ علاؤ الدین نے خسرو کے قصیدے پر جتنی بے توجہی اور لا پرواہی کا اظہار کیا ان کے قصائد کے لہجے میں اسی تناسب سے تیزی اور تندہی بڑھتی گئی۔ اس کی انتہا اس وقت ہوئی جب انہوں نے علاؤ الدین کو خلفائے راشدین کی خصوصیت کا امین اور قائم مقام کہہ دیا۔ ”یہ خلیفہ محمد نام رکھتا ہے اس کے

پاس حضرت ابوبکر کا صادق ہے اور حضرت عمر کا ساعدل ہے۔ اس کی جہاں داری کے کارناموں سے ایک کارنامہ بیان کرتا ہوں کہ حضرت عثمان کی طرح اس نے خدا تعالیٰ کی رحمت کی نشانیوں کو مصحف وجود کی جلد میں کس طرح یکجا کیا ہے اور حضرت علی کی طرح علم کے دروازوں کو مدینۃ السلام دہلی میں کس طرح رحمان اور خلق کی کلید سے وا کر دیا ہے (35)۔

”خسرو اس کے ساتھ ہی اس تعریفی پل کو عباسی دور کے خلفاء ہارون الرشید، مامون الرشید سے ہوتے ہوئے مستنصر اور امجدیہ کے خلیفہ ہارون الرشید سے ہیں۔ خسرو کی اس رائے سے شجاعت علی سندیلوی خاصے ناراض ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خسرو کی یہ رائے وقتی مصالحت آمیز اور اقتدار کے خوف کا نتیجہ ہے۔ ان کے مطابق علاؤ الدین کا عدل صرف استحکام سلطنت کے لئے تھا عدل فاروقی سے اس کو کیا نسبت۔ ”چونکہ نسبت پاک“ یعنی زمین کو آسمان سے کیا تعلق ہے (36)۔

علاؤ الدین خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ خسرو جلال الدین خلجی کے بے انتہا قریب تھے۔ مگر اسے کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس نے خسرو کی طرف دیکھا تک نہیں۔ شعر و شاعری اس کا میدان نہیں تھا۔ وہ ایک عظیم جنگ جو اور سیاستدان تھا لیکن وہ جاہل، گنوار اور لامذہب تھا (37)۔ اس کے لئے خسرو کی عشقیہ لکڑی اور مدھوش کردینے والی غزلیں شے لا حاصل تھیں۔ اس نے اپنی تعریف میں کہے گئے قصائد پر بھی توجہ نہیں دی۔ اس نے جلال الدین کی جانب سے خسرو کو دئے گئے 12 ہزار ٹیکے کا وظیفہ کم کر کے ایک ہزار کر دیا اور خلعت

فاخرہ سے بھی محروم کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ جلال الدین کی محفلوں کو آراستہ کرنے والے خسرو علاؤ الدین کے دربار میں چار ماہ تک کھڑے رہے پھر انہیں بیٹھنے کی اجازت دی گئی۔ ان بیس سالوں میں علاؤ الدین کا خسرو اور شیخ نظام الدین اولیا سے تعلقات صرف رسمی تھے۔ اس نے اپنے وقت کے کسی بھی صوفی اور شاعر میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی (38)۔

ہاں، علاؤ الدین کے بیٹے خضر خاں نے خسرو میں کافی دلچسپی دکھائی۔ خسرو اور خضر خاں گہرے دوست ہو گئے تھے۔ علاؤ الدین کی بے رخی پر خضر خاں کی دوستی نے مرہم کا کام کیا۔ خضر خاں کو شیخ سے بھی گہری عقیدت تھی۔ انہیں دونوں خسرو نے خضر خاں اور اس کی محبوبہ دول رانی پر ایک عشقیہ مثنوی لکھی۔ امن کے ان بیس سالوں میں خسرو کو کام کرنے کا بہت اچھا موقع ملا۔ انہوں نے اپنا سارا وقت ادبی سرگرمیوں میں خرچ کیا۔ یہ وقت ان کی تحریروں کے لئے عہد زریں کے طور پر یاد کیا جاسکتا ہے۔

## 8- قطب الدین مبارک شاہ (1316-20)

علاؤ الدین خلجی کی موت کے بعد اس کا تیسرا بیٹا مبارک خاں دلی کے تخت پر بیٹھا۔ اس نے قطب الدین مبارک شاہ کا لقب اختیار کیا۔ اس کے خسرو کے تعلقات جتنے اچھے تھے حضرت شیخ نظام الدین اولیا سے اتنے ہی خراب تھے۔ وہ تخت پر بیٹھتے ہی شیخ کے خلاف حملہ آور رخ اختیار کر لیا۔ وہ کھلے عام شیخ کے خلاف زہر اگلاتا رہتا۔ اس نے شیخ کا قتل کرنے والے کو ایک ہزار تھکے انعام دینے کا اعلان بھی کر رکھا تھا۔ اس نے علاؤ الدین خلجی کے بڑے بیٹے خضر خاں اور

شادی خاں جو پہلے سے ہی قید میں تھے قتل کرا دیا۔ شہاب الدین خاں کو بھی قتل کرا دیا۔

بد نظمی کے ان چار سالوں میں بھی خسرو نے بڑی ہوشیاری سے خود کو محفوظ کر لیا تھا۔ وہ اس دربار میں متواتر جاتے رہے جہاں ان کے پیر اور روحانی اتاد حضرت شیخ کے قتل کرنے اور انہیں نقصان پہنچانے کے منصوبے بنائے جاتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ متواتر درگاہ پر بھی حاضری دیتے رہے۔ خسرو کو اس بات سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا کہ مبارک شاہ کا کردار کیسا ہے۔ اس کا دربار بد کرداری، بے راہ روی اور اخلاق کشی کا انتہائی نمونہ تھا۔ اس کے دربار میں بھانڈ، ڈونمیاں اور مسخرے کھلے عام چلے آتے تھے۔ نوید بھانڈ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مادر زاد عریاں دربار میں چلا آتا اور امراء، ملک اور خانوں سے بدکلامی کرتا (39)۔ پھر بھی خسرو نے مبارک شاہ کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا۔

شہا! گنج بخشا! کرم گشترا!  
معانی شناسا سخن داد را  
جنیں بخششے کز تو جم با فتم  
ز شاہاں پیشینہ کم یافتم  
کنوں لابد از سحر سنج چو من  
اندازہ بخشش آید سخن (40)  
(اے بادشاہ، اے خزانہ دینے والے، اے کرم کرنے والے، علم و ہنر کی قدرو قیمت جاننے والے اور شعر و سخن کے سرپرست تجھ جیسے جمشید سے مجھے جو انعام ملا وہ گزشتہ زمانہ میں مجھے شاذ ہی ملا ہوگا۔ اب مجھ جیسے جادو نگار سے ضروری طور پر جو دو کرم کے مطابق مدح و ستائش ہوگی۔)

قطب الدین مبارک شاہ امر د پرست

تھا۔ اس کے اپنے غلام خسرو خاں سے تعلقات تھے۔ خسرو خاں پر مار راجپوت تھا (41)۔ بچپن میں ہی وہ مسلمان ہو گیا تھا۔ وہ گورا چٹا اور نہایت حسین و جمیل تھا۔ مبارک شاہ نے اسے خسرو خاں کا خطاب دے کر دربار میں ایک بڑا عہدہ دے رکھا تھا۔ ان دنوں دلی میں ترکی گھوڑا اور گجراتی گھوڑی کے متعلق خوب لطیفے بنتے تھے (42)۔ گھوڑا گھوڑی کے اس کھیل کی ادلا بدلی بھی ہوتی تھی۔ شیخ اپنی کرامات ظاہر کرنے کے حق میں کبھی نہیں رہے (43)۔ یوں بھی تاریخ میں کرامات کے لئے کوئی جگہ نہیں ہونی چاہئے مگر ٹھیک اس دن 7 مئی 1320 کی صبح جب مبارک شاہ نے شیخ کو اپنے دربار میں حاضر ہونے کا حکم دے رکھا تھا۔ لوگوں نے دیکھا کہ مبارک شاہ کا سر ہزار کھمبائل کی دیوار کے نیچے پڑا ہوا ہے۔ شیخ بہر حال اطمینان اور سکون سے اپنی خانقاہ میں موجود تھے۔

### 9- ناصر الدین محمد عرف خسرو خاں (1320)

مبارک شاہ کے قتل کے بعد خسرو خاں ناصر الدین محمد کے لقب کے ساتھ دلی کے تخت پر رونق افروز ہوا۔ اس کا اقتدار 1320 میں کچھ ایک ماہ تک ہی رہا۔ ایک دن خسرو خاں کو بھی مبارک شاہ کی طرح قتل کر کے محل کی دیوار کے نیچے پھینک دیا گیا۔ سلطان ناصر الدین محمد کا خسرو اور حضرت شیخ دونوں سے اچھے تعلقات تھے۔ خسرو خاں نے شیخ کی خانقاہ میں ڈھائی لاکھ تنکے نذرانہ بھیجوا یا تھا۔ شیخ نے اس خطیر رقم کو اسی دن غریاء و مساکین میں تقسیم کر دیا تھا۔

### 10- غیاث الدین تغلق (1320-25)

غیاث الدین تغلق کا دلی کے تخت پر بیٹھنا ایک اتفاقیہ واقعہ تھا۔ وہ بھی غلام تھا۔ اس کے بچپن کا نام ملک غازی تھا۔ اس نے اپنی زندگی کی شروعات علاؤ الدین خلجی کی فوج میں معمولی سپاہی کے طور پر کی تھی۔ ایک ادنیٰ سپاہی کا ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے اقتدار کے اعلیٰ مسند پر رونق افروز ہونا واقعی بہت بڑی کامیابی تھی۔ وہ خسرو کو بے حد پسند کرتا تھا مگر اسے شیخ کی بے نیازی پسند نہیں تھی۔ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ خسرو خاں نے جو رقم شیخ کی خانقاہ میں بھیجی تھی اسے واپس کیا جائے۔ دربار کے علماء کے اکسانے پر اس نے شیخ سے حال اور وجد جیسے موضوعات پر بحث بھی کی۔ دربار میں شیخ کی دلیلوں کو علماء انکار نہیں کر سکے۔ پھر انہیں جانے کی اجازت دے دی گئی۔ پھر بھی غیاث الدین کا کینہ کم نہیں ہوا۔ اس نے بنگال کی مہم پر جاتے ہوئے شیخ کے پاس پیغام بھیجا کہ اس کے دلی واپس آنے سے قبل شیخ دلی چھوڑ دیں۔

بنگال کی مہم پر سلطان کے ساتھ خسرو بھی تھے۔ انہوں نے غیاث الدین تغلق کے کارناموں کو جاگر کرنے کے لئے اپنی آخری شاندار مثنوی 'تغلق نامہ' لکھی (44)۔ غیاث الدین تغلق کے عہد میں امیر خسرو بہت امیر کبیر ہو گئے تھے اور فارغ البالی کی زندگی گزارتے تھے (45)۔ بنگالے کی کامیاب مہم کے بعد سلطان شاہی لشکر کو پیچھے چھوڑ کر تیزی سے دلی کی طرف بڑھا۔ خسرو لشکر کے ساتھ رہ گئے۔ سلطان کی دلی واپسی جب قریب آگئی تو ایک دن شہر کو توال نے شیخ کے پاس پہنچ کر انتہائی ادب و احترام اور دردمندی سے انہیں سلطان کا دلی چھوڑنے کا فرمان سنایا۔ شیخ نے کہا کہ تم

پر سکون رہو اور آرام سے گھر جاؤ 'ہنوز دلی دور است'۔ اسی شام دلی سے چند میل دور کھانا کھانے کے بعد سلطان کے استقبال کے لئے تعمیر کیا گیا ایک شاندار دروازہ اس کے اوپر ہی گر گیا۔ لوگوں نے سلطان کی موت کو شیخ کی ناراضگی سے جوڑ کر دیکھا۔ مگر ایک تاریخ داں کے لئے ایسا سوچنا شدید مناسب نہ ہو۔

### 11- محمد بن تغلق (1325)

مشتبہ حالت میں استقبالیہ دروازہ گرنے سے ہوئی غیاث الدین تغلق کی موت کے بعد اس کے بیٹے اور ولی عہد جو ناخاں موسوم بہ الغ خاں کو دلی کے تخت پر بیٹھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اس نے محمد بن تغلق کا لقب اختیار کیا۔ غیاث الدین کے حادثے کو مشتبہ قرار دینے میں ابن بطوطہ کا اہم رول ہے۔ یہ شبہ اس وقت مزید گہرا ہو جاتا ہے جب معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن تغلق نے استقبالیہ دروازہ تعمیر کروانے والے احمد یازشہ کو خواجہ جہاں کا خطاب دے کر وزیر الملک کے عہدے پر فائز کر دیا تھا اس نے اس معاملے میں کسی کو سزا بھی نہیں دی اور نہ ہی کسی سے باز پرس کی (46)۔ محمد تغلق اعلیٰ تعلیم یافتہ سلطان تھا۔ وہ شاعر تھا اور اچھے شعر کہتا تھا۔ وہ ماہر فلکیات، ماہر ریاضی اور ماہر فلسفہ اور منطق تھا۔ اس کی تخت نشینی کے جشن میں ہر خاص و عام نے شرکت کی۔ وہ مختلف النوع قسم کا آدمی تھا۔ ایک طرف جہاں وہ غریبوں اور مسکینوں کے درمیان سونے چاندی کے سکے بچھوڑ کر تا وہیں بات بات پر قتل کے احکامات بھی صادر کرتا رہتا تھا۔ بغیر خون بہائے وہ اشرافیاں نہیں بانٹتا تھا (47)۔

جب محمد بن تغلق تخت شاہی پر جلوہ افروز



ہوا خسرو شاہی لشکر کے ساتھ دلی آرہے تھے۔ دلی پہنچتے ہی خسرو تغلق کے دربار میں قصیدہ لیکر پہنچ گئے۔ انہوں نے غیاث الدین تغلق کے حادثے پر ذرا بھی اظہار تاسف نہیں کیا جب کہ ان کا ہم عصر اور عمر میں چھوٹے رہے مورخ ضیاء الدین برنی نے غیاث الدین کی موت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔ خسرو کے دلی پہنچنے اور تغلق کی تخت نشینی سے قبل ہی شیخ کا وصال ہو چکا تھا۔ خسرو کے زیادہ تر (شبلی نعمانی، صباح الدین عبدالرحمن، وحید مرزا، محمد مجیب، محمد حبیب اور ظ انصاری وغیرہ) سوانح نگاروں کا کہنا ہے کہ جب خسرو بنگالے کی مہم سے دلی واپس آئے اور انہیں شیخ کے وصال کی خبر ملی تو انہوں نے سیاہ لباس زیب تن کر لیا، اور دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر کے گوشہ نشین ہو گئے۔ اس میں حقیقت کا فقدان ہے۔ ممتاز حسین نے اپنی کتاب امیر خسرو دہلوی حیات اور شاعری میں اس واقعے پر تفصیلی نوٹ لکھا ہے۔ ان کے مطابق نہایت الکمال میں شامل محمد تغلق کی تعریف میں کہے گئے خسرو کے دو قصیدے اس بات کی تردید کرتے ہیں کہ انہوں نے ترک دنیا کر دیا تھا۔ خسرو نے ترک دنیا کر دیا ہوتا تو تغلق کے دربار کا رخ نہیں کرتے (48)۔ محمد بن تغلق کی تعریف میں کہے گئے خسرو کے قصیدے اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ خسرو نے دلی پہنچنے کے بعد تغلق کے دربار سے رشتہ بنائے رکھا۔ محمد بن تغلق سے خسرو کے رشتے نئے نہیں تھے بلکہ اس کی دلی عہدی کے زمانے سے ہی ان کے تعلقات استوار تھے۔ محمد بن تغلق شیخ سے بھی گہری وابستگی رکھتا تھا۔ غیاث الدین کی شیخ سے ناراضگی کے بعد بھی محمد بن تغلق شیخ کے پاس جاتا

رہتا تھا۔ جب غیاث الدین تغلق بنگالے سے واپسی کر رہا تھا محمد تغلق نے شیخ کے وصال پر ان کے جنازے کو کندھا بھی دیا تھا اور اس سے قبل شیخ نے کسی موقع پر کہا تھا کہ ہم نے تمہیں دلی کی سلطنت بخشی۔ (49)

در اصل خسرو ایک متحرک اور بے چین طبیعت کے مالک تھے۔ ان کا ایک حال پر قائم اور مطمئن رہنا ناممکن تھا (50)۔ ایسی حالت میں ان سے گوشہ نشینی کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے۔ چاہے شیخ سے ان کی جتنی بھی گہری عقیدت اور محبت کیوں نہ رہی ہو انہوں نے کبھی اپنی رندی اور جاہ طلبی کو خیر یاد نہیں کہا (51) ہمیشہ ان کی دنیا داری ان کے تصوف پر غالب رہی۔ زندگی کے آخری پڑاؤ میں بھی کہے گئے ان کے اشعار سے جاہ پسندی اور لذت پرستی کی بو آتی ہے۔

اس میں کوئی شک وہ شبہ کی گنجائش نہیں کہ حضرت شیخ خسرو پر بہت زیادہ اعتماد کرتے تھے۔ شیخ کے دربار میں 200 لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی اور خسرو چلے جاتے تو محفلوں میں ہمیشہ اپنی نظریں نیچی رکھنے والے شیخ انہیں دیکھ کر مسکراتے اور اپنے پہلو میں بیٹھنے کا اشارہ کرتے۔ جو لوگ بھی وہاں بیٹھے ہوتے وہ خسرو کے لئے جگہ خالی کر دیتے (52)۔ اس کے بعد شیخ پوچھتے کیا حال ہے۔ پھر خسرو پورے دن کی سیاسی سرگرمیوں اور دلی کی گلیوں میں چل رہے دلچسپ واقعات اور خبروں کے متعلق تفصیل سے بتاتے۔ جب سلاطین وقت کے درباروں میں شیخ کے خلاف سازشیں کی جاتی رہیں تب بھی خسرو کی شیخ سے قربت پر کسی نے شک نہیں کیا۔ سلاطین وقت بیک وقت خسرو سے بے

انہتا محبت اور شیخ سے بے انہتا نفرت کر سکتے تھے۔ شیخ سے خسرو کی قربت کا معاملہ سلاطین کے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ شیخ کے وصال کے بعد خسرو تقریباً 8 ماہ تک زندہ رہے مگر انہوں نے شیخ کی جدائی میں کوئی دلدوز مرثیہ نہیں لکھا۔ یہ بات حیران کرتی ہے اگر واقعی خسرو نے شیخ کے وصال کے غم میں سیاہ لباس زیب تن کر کے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہوتی تو انہیں شیخ کی یاد میں ایک پر اثر مرثیہ بھی لکھنا چاہئے تھا۔ لیکن روایت کے مطابق خسرو نے شیخ کے مزار پر یہ ہندوی دوہا پڑھا۔

گوری سوئے سیچ پر مکھ پر ڈارے کیش  
چل خسرو گھر اپنے سانجھ بھی چوندیش  
کبھی شیخ نے خسرو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ تم میرے بعد زیادہ دن زندہ نہیں رہو گے۔ خسرو پر اس کا نفسیاتی اثر Psycho Effect بھی رہا ہوگا۔ 1325 میں ہی شیخ کے وصال کے 6 سے 8 ماہ کے اندر اسی تاریخ کو خسرو ’تضادوں بھری دلکش دنیا‘ (53) سے کوچ کر گئے۔ انہیں شیخ کے مزار کے سامنے ہی دفن کیا گیا۔

#### حوالہ جات:

- 1۔ امیر خسرو کی جمالیات از شکیل الرحمن، موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی۔ 1996
- 2۔ ہندوستانی مسلمان از محمد مجیب، این سی پی یو ایل نئی دہلی۔ 1998
- 3۔ خسرو شناسی از ظ انصاری، این سی پی یو ایل نئی دہلی۔ 1998 مقدمہ ص: 17 ط انصاری ابوفیض سحر،
- 4۔ تاریخ فرشتہ از محمد قاسم فرشتہ جلد اول اردو ترجمہ عبدالحی خواجہ ایم اے۔ مکتبہ ملت

- دیوبند 1983
- 22۔ بحوالہ ہندوستانی مسلمان
- 5۔ امیر خسرو دہلوی حیات و شاعری از ممتاز حسین۔ نیشنل کمیٹی برائے سات سو سالہ تقریبات امیر خسرو کراچی۔ 1975
- 6۔ خسرو شناسی از ظ انصاری، مقالہ امیر خسرو کی صوفیانہ شاعری۔ اسلوب احمد انصاری: 142
- 7۔ مقالہ دلی کے حضرت امیر خسرو از محمد حبیب، مدہ کالین بھارت 2 مرتب عرفان حبیب۔ راج کمل پرکاش نئی دہلی 1999
- 8۔ امیر خسرو دہلوی حیات اور شاعری
- 9۔ دلی از خشونت سنگھ کتاب گھر نئی دہلی۔ 2002
- 10۔ دلی از خشونت سنگھ ص: 72
- 11۔ ہندوستانی مسلمان ص: 240
- 12۔ خسرو شناسی۔ مقالہ امیر خسرو کی صوفیانہ شاعری از اسلوب احمد انصاری
- 13۔ مقدمہ ص: 22 خسرو شناسی
- 14۔ مقالہ دلی کے حضرت امیر خسرو۔ مدھیہ کالین بھارت 2
- 15۔ خسرو شناسی
- 16۔ بحوالہ۔ خسرو اور عہد خسرو از عبدالرؤف عروج، نیشنل کمیٹی برائے سات سو سالہ تقریبات امیر خسرو کراچی۔ 1975
- 17۔ خسرو اور عہد خسرو ص: 52
- 18۔ امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری از شجاعت علی سندیلوی ص 23 اور نیشنل پبلیشنگ ہاؤس لکھنؤ۔ 1969
- 19۔ خسرو شناسی ص: 24
- 20۔ خسرو شناسی ص: 25
- 21۔ خسرو اور عہد خسرو ص: 67
- 22۔ بحوالہ ہندوستانی مسلمان
- 23۔ دلی
- 24۔ شعر العجم جلد دوم از شبلی نعمانی دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔ 2018
- 25۔ بحوالہ۔ خسرو اور عہد خسرو ص: 82
- 26۔ خسرو اور عہد خسرو ص: 81
- 27۔ خسرو اور عہد خسرو ص: 81
- 28۔ منتخب التواریخ جلد اول از ملا عبدالقادر بدایونی ص: 109 این سی پی یو ایل نئی دہلی 2008
- 29۔ مدھیہ کالین بھارت جلد دوم، مقالہ دلی کے حضرت امیر خسرو
- 30۔ تاریخ فیروز شاہی از ضیاء الدین برنی بحوالہ خسرو اور عہد خسرو
- 31۔ مقالہ الفتوح از امیر خسرو بحوالہ امیر خسرو دہلوی حیات و شاعری ص: 188
- 32۔ تاریخ ہندوستان 1526 تک از ڈاکٹر عبدالقیوم ص: 222۔ نصاب پبلیکیشنز حیدرآباد۔ 2008
- 33۔ بحوالہ خسرو اور عہد خسرو ص: 116
- 34۔ امیر خسرو اور ان کا ہندی ساہتیہ (ہندی) از ڈاکٹر بھولا ناتھ تیواری، پر بھارت پرکاش نئی دہلی 2012
- 35۔ خزائن الفتوح از امیر خسرو بحوالہ خسرو اور عہد خسرو ص: 114
- 36۔ امیر خسرو اور ہندی شاعری ص: 41
- 37۔ تاریخ فرشتہ جلد اول از محمد قاسم فرشتہ ترجمہ عبدالحی خواجہ ایم اے ص: 353-54
- 38۔ خسرو شناسی
- 39۔ امیر خسرو عہد، فن اور شخصیت از عرش ملیانی، مرکز تصنیف و تالیف نکودر لکھنؤ
- 40۔ امیر خسرو از سید غلام سمنانی ص: 36۔ نیشنل بک ٹرسٹ نئی دہلی 1995
- 41۔ ابن بطوطہ کی بھارت یا ترا (ہندی) نیشنل بک ٹرسٹ نئی دہلی۔ 2011
- 42۔ دلی از خشونت سنگھ
- 43۔ ہندوستانی مسلمان ص: 161 ” جس طرح پیغمبروں پر یہ فرض تھا کہ وہ معجزہ دکھائے اسی طرح صوفی کا فرض ہے کہ وہ اپنی کرامت کو چھپائے۔“
- 44۔ تاریخ فرشتہ جلد اول از محمد قاسم فرشتہ ترجمہ عبدالحی خواجہ ایم اے ص: 209
- 45۔ تاریخ فرشتہ جلد اول از محمد قاسم فرشتہ ترجمہ عبدالحی خواجہ ایم اے
- 46۔ ابن بطوطہ کی بھارت یا ترا (ہندی)
- 47۔ ابن بطوطہ کی بھارت یا ترا ص: 68۔ ابن بطوطہ اپنے سفر نامہ ہند of India Travelling Accounts میں محمد بن تغلق کے خون بہانے کے ساتھ اشرفیاں لٹانے کے واقعے کو ایک لائن میں بیان کر کے نکل جاتا ہے مگر 16 ویں صدی کا مشہور مورخ محمد قاسم فرشتہ (1560-1620) اسے خوب نمک مرچ کے ساتھ ذائقہ دار افسانہ بناتا ہے
- 48۔ امیر خسرو دہلوی حیات اور شاعری
- 49۔ ابن بطوطہ
- 50۔ خسرو شناسی کی بھارت یا ترا (ہندی)
- 51۔ امیر خسرو دہلوی حیات و شاعری
- 52۔ دلی
- 53۔ خسرو شناسی ص: 39

# اردو کی ترقی میں علمائے مدارس کا کردار

جہاں تک اردو کی ترقی میں مدارس کے رول کا سوال ہے تو اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ یہ ایک اہم موضوع ہونے کے ساتھ ہی ابھی تک تشنہ بھی ہے، اور اس موضوع پر اطمینان بخش کام کرنے کی ضرورت ہے ہے ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم کا سب سے بڑا ذریعہ اسلامی مدارس ہیں، اور مدارس کا براہ راست تعلق عربی اور فارسی سے ہے، مگر اس کے ساتھ ہی اردو کا اس سے جو رشتہ ہے اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اگر ہم آج بھی غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اردو زبان و ادب کی ترقی کا 65 فیصد دارو مدار انہی مدارس پر منحصر ہے، اس کی سب سے بڑی اور خاص وجہ یہ ہے کہ اردو اور عربی کی قواعد میں بڑی حد تک مماثلت ہے جس کی وجہ سے عام اسکولوں اور کالج کے علاوہ مدارس کے طلباء اردو میں بہت جلد عبور حاصل کر لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات صحیح ہے کہ مدارس میں اردو کی حیثیت ثانوی ہے، مگر اس تناظر میں پروفیسر ابوالکلام قاسمی کا یہ قول صد فیصد درست ہے۔

”جہاں تک اردو کا سوال ہے تو مدارس میں یوں تو براہ راست اردو زبان و ادب کی تدریس نہیں ہوتی ہے مگر قواعد اور گرامر کی سطح پر طالب علم کی لسانی بنیادیں جس قدر مستحکم ہو جاتی ہیں اسی صلاحیت کے باعث اردو کے لسانی پس منظر کے طور پر عربی اور فارسی الفاظ سے مصادر اور مشتقات کا اصولی علم بھی حاصل ہو جاتا ہے، صفت، موصوف، مضاف اور مضاف الیہ، اسم، ضمیر، فاعل، مفعول، یا امر اور نہی، اس طرح کے کبھی قواعدی اصطلاح دراصل طالب علم کو صرف ونحو سے پوری طرح باخبر کر دیتی ہے، یہی باخبری اس کی اردو لسانی اور ادبی استعداد میں ہمیشہ معاون ثابت ہوتی ہے۔

(اردو دنیا۔ مئی، 2013، ص 21-20)

اردو صرف اظہار گفتگو کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ وہ زبان ہے، جس نے گنگا جمنی تہذیب کو فروغ دیا وہیں دوسری طرف اس کو آزادی کی زبان بھی کہا گیا، اردو کے حوالے سے بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ اس زبان نے انسان کو انسانیت کا درجہ دلایا ہے، اردو نے لوگوں کو یہ بھی سکھایا کہ سماج میں کیسے رہنا چاہئے، جب ہم تاریخ ادب اردو پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے مغل دور اقتدار میں

جون ۲۰۱۹ء تا اگست ۲۰۱۹ء



## شاداب اختر فلاحی

پرنسپل مدرسہ شیخ رمضان، بسڈیلا  
معین الدین، پتھر دیوا، دیوریا  
رابطہ: 9410889690

فارسی کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل تھا، اس کے بعد جس زبان کو سب سے زیادہ مقبولیت ملی وہ اردو ہی ہے، آزادی کے متوالوں نے جس زبان کو وسیلہ اظہار بنایا تو وہ کوئی اور زبان نہیں بلکہ اردو زبان ہی تھی، یہ ایک ایسی زبان ہے جس میں معنی کی وسعت اور شیرینی بدرجہ اعلیٰ موجود ہے، اس لئے ادباء، شعراء، علماء کے علاوہ مجاہدین آزادی نے نوجوانوں اور خواب غفلت میں پڑے لوگوں میں جوش و ولولہ پیدا کرنے کے لئے اردو کا پرزور استعمال کیا، یہاں تحریک آزادی کا ذکر ہمیں بہتر اس لئے معلوم ہو رہا ہے کہ مجاہدین آزادی میں اکثر و بیشتر کا تعلق مدارس سے تھا اس لئے انہوں نے اپنے خیالات کی ترسیل کے لئے اردو کو ذریعہ بنایا، اس تناظر میں ڈاکٹر غلام نجی انجم کا قول ملاحظہ فرمائیں۔

”اردو زبان جس کو نیست و نابود کرنے کے لئے نہ جانے کتنی اسکیمیں تیار کی گئیں اور حد تو یہ ہے جو اردو کے نمک خوار ہیں وہی اردو کی جڑیں کھولنے پر تے ہوئے ہیں، مگر یہ دینی مدارس کا فیضان ہے کہ تمام تر نامساعد حالات اور ہزار ہا مخالفتوں کے باوجود یہ مدارس اردو کو باقی رکھے ہوئے ہیں (دینی مدارس اور عہد حاضر کے تقاضے۔ ص-165)

سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ علماء مدارس نے قرآن کو سمجھنے کے لئے اردو زبان میں ترجمہ و تفسیر کرنا شروع کیا اور آج بھی ہمارے پاس قدیم اردو زبان قرآن کے ترجمے کی شکل میں موجود ہے، مدارس میں چونکہ قرآن اور عربی زبان کی عبوری تعلیم دی جاتی ہے اس لئے بیشتر مشکل اصطلاحات اور دقیق الفاظ کی تعبیر و تشریح اردو میں ہی کی جاتی ہے، اس طرح دین کی تبلیغ کی خاطر صوفیاء کرام اور علماء مدارس نے اردو کا

ہی سہارا لیا، اور ان سے بہت سی مثنویاں، ملفوظات، وظائف، فضائل اعمال، احادیث کے ترجمے اور قرآن کے ترجمے وغیرہ منسوب ہیں، اس سلسلے میں مولوی عبدالحق کا کارنامہ ”اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیاء کرام کا حصہ“ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ جب ہماری نظر شعراء اور ادیبوں پر پڑتی ہے تو ہمیں ایسے شعراء اور ادیبوں کی ایک لمبی فہرست دکھائی دیتی ہے جن کی ابتدائی تعلیم مدرسے میں ہوئی ہے اور بعض کی عربی اور فارسی کی رسمی تعلیم گھر پر ہوئی اسلئے زبانی اعتبار سے دیکھا جائے تو ان کا بھی تعلق مدرسہ سے ہی ہے اور ان کی شہرت اور مقبولیت کا راز بھی اردو ہی ہے۔

اردو ادب میں کوئی ایسا میدان باقی نہیں ہے جو علماء مدارس کے گراں قدر خدمات سے باقی رہا ہو اگر ناول نگاری پر نظر ڈالتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں مولانا ڈپٹی نذیر احمد نظر آتے جنہوں نے توبہ النصوح، ابن الوقت، مرآة العروس، فسانہ مبتلا وغیرہ ناول اردو کو دینے، افسانہ نگاری ناول نگاری، صحافت نگاری، خاکہ نگاری، غزل گوئی، قصیدہ نگاری، مثنوی نگاری، نظم نگاری گویا اردو کا کوئی ایسا صنف نہیں ہے جو علماء مدارس نظر سے بچ سکا ہو جبکہ تحقیق پر مولوی عبدالحق، مولانا امتیاز علی خان عرشی، مولانا قاضی عبدالودود وغیرہ نے گہری نظر ڈالی اس کے علاوہ انہوں نے تحقیق کو فکری اور فنی ہر اعتبار سے مضبوط کیا، تنقید نگاری پر اگر نظر ڈالی جائے تو بجا طور پر ہمیں مولانا الطاف حسین حالی کی کتاب ”مقدمہ شعر و شاعری“ کو مرکز میں پڑتا ہے، کیوں کہ بغیر اس کے ذکر کے تنقید کی کوئی بھی بات مکمل نہیں ہو سکتی ہے۔

اگر اردو صحافت کے میدان میں دیکھا جائے تو اکثریت ایسے علماء کی نظر آتی ہے جنہوں نے اردو صحافت میں نمایا کارنامہ انجام دیا ہے، مولوی محمد باقر (اردو اخبار) مولانا ظفر علی خاں (زمیندار لاہور) مولانا ابوالکلام آزاد (الہلال، البلاغ) مولانا محمد علی جوہر (ہمدرد) مولانا حسرت موہانی (اردوئے معلیٰ) علامہ راشد الخیری اور مولانا عبدالمجید دریا آبادی وغیرہ جن کا تعلق مدرسہ سے رہا ہے اس کے علاوہ سرسید تحریک (علی گڑھ تحریک) سے بھی اردو کے فروغ میں کافی مدد ملی اس کا ذکر اس لئے مناسب ہے کہ رسمی نہ صحیح اس زمانے کے روایت کے مطابق ان کی بھی تعلیم عربی فارسی اور اردو میں ہی ہوئی تھی اس تحریک کے جانشین مولوی نذیر احمد، مولوی چراغ علی، مولوی ذکاء اللہ، مولانا الطاف حسین حالی، اور علامہ شبلی نعمانی ان سب کا تعلق مدرسہ سے رہا ہے اور انہوں نے اردو کو ایسے مقام تک پہنچایا جہاں اور مزید اضافے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

دور جدید میں اگر فارغین مدارس کے حوالے سے اردو کی ترقی کی بات کی جائے تو ان میں بعض کا تعلق براہ راست اردو سے ہے، اور بعض مختلف علوم و فنون میں مہارت رکھنے کے ساتھ اردو کی ترقی میں اہم رول ادا کر رہے ہیں، ان میں حقانی القاسمی، مولانا عبدالحمید نعمانی، پروفیسر ابو سفیان اصلاحی، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر سعود عالم قاسمی، ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی کے علاوہ بے شمار ایسے فارغین مدارس ہیں جو مختلف اردو ادبی رسائل اور اخباروں میں اردو کی خدمات انجام دے رہے ہیں جن کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا جاسکتا ہے، بقول ڈاکٹر توقیر راہی،

”اس میں دو رائے نہیں کہ اردو اور مدارس ایک دوسرے سے مربوط ہیں، اس کی زندہ اور عملی مثال مدارس کا ذریعہ تعلیم ہے، اس طرح دینی تعلیم کی ترویج و اشاعت کے علاوہ اردو زبان کو برصغیر کے کونے کونے تک پھیلانے میں مدارس کا بہت بڑا حصہ ہے، اگرچہ نصابی کتابیں عموماً عربی میں ہوتی ہیں لیکن ہندوستان کے مدرسوں میں اعلیٰ تعلیم اردو میں دی جاتی ہے، خواہ یہ مدرسے شمال میں قائم ہوں یا جنوب مشرق میں ہوں، مغربی ہند میں مدرسے کے طلبہ کی راہ میں ملک کی جغرافیائی، لسانی اور تہذیبی حد بندیاں رکاوٹ نہیں، بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض میں جہاں کہیں بھی کوئی عالم ہوگا وہ اردو ضرور جانتا ہوگا“ (اردو دنیا، ص-16 مئی 2013)

اب اردو کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا صرف یونیورسٹی اور کالجوں تک محدود نہیں ہے بلکہ خود مدارس نے بھی ایسے اقدامات کئے ہیں، جہاں طلباء کی تحریری، تقریری اور کمپوزنگ و صحافتی صلاحیت کو فروغ دیا جا رہا ہے، جس سے مدارس کے طلباء کے ذوق و شوق میں اور مزید اضافہ ہو رہا ہے، ساتھ ہی اخبارات و رسائل، ترجمہ نگاری، مضمون نویسی اور صحافت کے میدان میں طلباء مدارس کی اچھی خاصی تعداد ابھر کر سامنے آرہی ہے، دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء، جامعۃ الفلاح اور مدرسۃ الاصلاح جیسے عظیم دینی درسگاہوں طلباء کی تقریری اور تحریری، تصنیفی اور تالیفی صلاحیت کو فروغ دینے کے لئے خاص توجہ دی جا رہی ہے، یہاں تک جامعۃ الفلاح میں ہونہار افراد کے لئے ایک مرکزۃ الدعوہ (داعوت سینٹر) کا قیام عمل میں لایا گیا ہے جس میں تصنیف و تالیف سے لیکر

سیاسی، سماجی، اقتصادی، مذہبی، تہذیب و تمدن کے علاوہ دیگر بہت سے مسائل مذاکرات کا موضوع بنتے ہیں، علاوہ ازیں مدارس نے اردو

سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ علماء مدارس نے قرآن کو سمجھنے کے لئے اردو زبان میں ترجمہ و تفسیر کرنا شروع کیا اور آج بھی ہمارے پاس قدیم اردو زبان قرآن کے ترجمے کی شکل میں موجود ہے، مدارس میں چونکہ قرآن اور عربی زبان کی عبوری تعلیم دی جاتی ہے اس لئے پیشتر مشکل اصطلاحات اور دقیق الفاظ کی تعبیر و تشریح اردو میں ہی کی جاتی ہے، اس طرح دین کی تبلیغ کی خاطر صوفیاء کرام اور علماء مدارس نے اردو کا ہی سہارا لیا، اور ان سے بہت سی مثنویاں، ملفوظات، وظائف، فضائل اعمال، احادیث کے ترجمے اور قرآن کے ترجمے وغیرہ منسوب ہیں، اس سلسلے میں مولوی عبدالحق کا کارنامہ ”اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیاء کرام کا حصہ“ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔

جب ہماری نظر شعراء اور ادیبوں پر پڑتی ہے تو ہمیں ایسے شعراء اور ادیبوں کی ایک لمبی فہرست دکھائی دیتی ہے جن کی ابتدائی تعلیم مدرسے میں ہوئی ہے اور بعض کی عربی اور فارسی کی رسمی تعلیم گھر پر ہوئی اسلئے زبانی اعتبار سے دیکھا جائے تو ان کا بھی تعلق مدرسہ سے ہی ہے اور ان کی شہرت اور مقبولیت کا راز بھی اردو ہی ہے۔ اردو ادب میں کوئی ایسا میدان باقی نہیں ہے جو علماء مدارس کے گراں قدر خدمات سے باقی رہا ہو۔

کی ایسی عظیم ہستیاں بھی پیدا کی ہیں جو اردو خطابت کے میدان میں مرد آہن ہیں خواہ اردو

ادب، اردو صحافت یا اردو خطابت ہو سب میں مدارس کے پروردہ پیش پیش نظر آئیں گے، بقول عتیق الرحمن مجیب رحمانی۔

”اسلامی مدارس اپنے مقصد قیام میں پوری طرح کامیاب ہے، اور تاریخ کے ہر دور میں انہوں نے ایک بڑی تعداد میں مذکورہ مطلوبہ صفات کے حامل افراد پیدا کرنے میں نمایاں رول ادا کیا ہے“۔ (خصوصی شمارہ، ص-12، راشٹریہ سہارا اردو، 12 اگست 2007)

اردو کا تعلق مدارس سے پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے۔ مدارس کے افراد ملکی سطح سے لیکر عالمی پیمانے تک آج بھی پھیلے ہوئے ہیں، اور وہ عالمی سطح پر اردو کی خدمت کا کام انجام دے رہے ہیں۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے اردو کو تنگ نظری اور تعصب پرستی کی نظر سے دیکھا جائے، اور کسی مذہب اور گروہ سے جوڑا جائے۔ کیوں کہ زبان کسی مذہب گروہ اور فرقے کا نہیں ہوتا ہے وہ صرف اور صرف رابطے کا ذریعہ

ہوتا ہے، اس کے ساتھ ہی مدارس میں اب رسالہ کا چلن بھی عام ہو رہا ہے اس کی زندہ مثال ”حیات نو“، ”الندوہ“، ”رفیق منزل“ وغیرہ ہیں جن کا مقصد طلباء کی تخلیقی، تحریری صلاحیت کو فروغ دینا ہے۔ مگر اس کا دوسرا بڑا فائدہ اردو کا فروغ ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی اعتراض کیا جاسکتا ہے مدارس میں صرف مقصدیت کو اولیت دی جاتی ہے مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے مدارس کے ایسے بہت سے علماء اور فضلاء ہیں جو ادبی اور شعری ذوق سے بخوبی آشنا ہیں اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنی پوری زندگی اردو کی خدمت میں گزار دی۔

□□□

جون ۲۰۱۹ء تا اگست ۲۰۱۹ء

# وقار صدیقی کی تصنیف دوسر فروش شاعر: ایک جائزہ

وقار صدیقی شہر گوالیار کے ادبی حلقے میں محتاج تعارف نہیں۔ وہ بیک وقت شاعر، نثر نگار اور سماجی خدمت گار ہیں۔ پوری زندگی درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ اب ضعیفی میں بھی یہ عالم ہے کہ ادبی، تحقیقی و تنقیدی کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔ موصوف کی چار (۴) کتابیں شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں۔ ذیل میں ان کی کتاب ”دوسر فروش شاعر: رام پرشاد بسمل اور اشفاق اللہ خاں حسرت“ کا تبصراتی جائزہ لینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

مذکورہ تصنیف انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی کے سلسلہ مطبوعات کی ایک کڑی ہے۔ اس کا سلسلہ مطبوعات نمبر ۱۶۲۶، صفحات ۱۷۹، قیمت ۱۸۰ ہے۔ صفحہ ۵ تا ۶ فہرست پر مشتمل ہے۔ حرف آغاز انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری، ماہ نامے اور ہفت روزہ ہماری زبان کے مدیر اطہر فاروقی نے تحریر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

”کتاب دوسر فروش شاعر کی خوبی یہ ہے کہ اس میں سامراجی حکومت کے ظالمانہ نظام سے پیدا ہونے والے نتائج اور پھر حصول آزادی کے پیش نظر جنگ کی تیاری، منصوبہ بندی اور انقلابی جدوجہد کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ رام پرشاد بسمل اور اشفاق اللہ خاں حسرت کے حالات زندگی اور کارناموں کو تاریخی حقائق کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے“

(دوسر فروش شاعر: رام پرشاد بسمل اور اشفاق اللہ خاں حسرت: وقار صدیقی، صفحہ ۷ تا ۸)

پروفیسر ہرنس کھیا (سابق شعبہ تاریخ، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی) نے پیش لفظ میں وقار صدیقی کی عرق ریز محنت پر روشنی ڈالی ہے۔ لکھا ہے کہ:

”وقار صدیقی صاحب نے جس محنت کے ساتھ ان دوشہیدوں پر گہری ریسرچ کر کے یہ مختصر کتاب پیش کی ہے۔ یہ ہم سب کے لئے ایک یاد دہانی کا کام کرتی ہے“

(دوسر فروش شاعر: رام پرشاد بسمل اور اشفاق اللہ خاں حسرت، صفحہ ۱۱)

پیش لفظ کے بعد مضمون بعنوان ’قومی انقلابی تحریک: ایک تعارف‘ تشریف اندیم نئی دہلی کی فکر کا نتیجہ ہے۔

جون ۲۰۱۹ء تا اگست ۲۰۱۹ء



شبانہ کھٹ انصاری

مہمان اسسٹنٹ پروفیسر  
شعبہ اردو، گورنمنٹ کملارا جا  
گرلس پی جی کالج، لشکر، گوالیار



اس مضمون میں انہوں نے ہندوستان میں قومی انقلابی تحریک کے متعلق مختصر مگر اہم معلومات دست یاب کرائی ہیں۔ اس ضمن میں کتاب پر گفتگو کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ ”رام پرشاد لہلہ اور اشفاق اللہ خاں

وارثی کے بارے میں۔۔۔ اردو میں بہت ہی کم مواد موجود ہے۔۔۔ یہ کتاب مذکورہ کمی اور مذکورہ کمزوری کو دور کرنے کے ایک عمل کا نقطہ آغاز ہو اور ہمارے عوام اس طرح اپنے شہیدوں کے عظیم کردار سے، ان کی جدوجہد سے اور ان کے نصب العین سے واقفیت حاصل کر کے خود اپنے اجتماعی عمل کے لئے ترغیب حاصل کر سکیں“

(دوسرے فروش شاعر: رام پرشاد لہلہ اور اشفاق اللہ خاں حسرت، صفحہ ۱۵)

مصنف وقار صدیقی نے دیباچہ (صفحہ ۱۷ تا ۲۰) تحریر کیا ہے۔ دیباچے میں انہوں نے دوسرے فروشوں میں یکسانیت، اُن کا تحریک سے وابستہ ہونا تختہ دار پر چڑھنا وغیرہ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ ایسے ملک کے شیدائی اور سرفروشن کی یاد دہانی کے مقصد ہی سے یہ تصنیف عالم وجود میں آئی۔

کتاب دوسرے فروش شاعر واضح طور پر دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ رام پرشاد لہلہ اور دوسرا حصہ اشفاق اللہ خاں حسرت کی حیات، شخصیت اور شاعری پر منحصر ہے۔ وقار صدیقی کی زیر نظر تصنیف دو ایسے اشخاص پر مشتمل ہے، (جو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ انقلابی بھی تھے) کی سوانح، شاعری اور شخصیت سے روشناس کرائی ہے۔ موصوف نے دونوں ہی کے خاندانی حالات، پیدائش، بچپن، تعلیم و تربیت وغیرہ پر

بڑی باریک بینی سے نگاہ ڈالی ہے۔ اُن کا سوانحی اسلوب بڑا دل کش ہے۔ زبان و بیان سادہ، سہل اور آسان ہے۔ مختصر اور خوب صورت جملے سوانحی حالات اور تاریخی واقعات کو دل چسپ بناتے ہیں۔ مثلاً

”رام پرشاد مرلی دھر کے بیٹے تھے۔ ان کے والد نرائن لال نے ایک مکان بھی خرید لیا تھا، گویا اب رہنے کا ایک ٹھکانہ ہو گیا تھا۔ آخر وہ بڑے دن ختم ہوئے۔ مرلی دھر میونسپلٹی میں پندرہ روپے ماہوار تنخواہ پر ملازم ہو گئے۔ ان کی شادی کر دی گئی۔ انہیں یہ ملازمت پسند نہیں تھی۔ کچھ عرصے بعد ملازمت چھوڑ کر عدالت میں سرکاری اسٹامپ فروخت کرنے لگے۔ ۱۱ جون ۱۸۹۷ کو مرلی دھر کے یہاں شاہ جہاں پور (یوپی) کے محلہ جوکھرنی باغ کے قریب رام پرشاد پیدا ہوئے تھے۔ مرلی دھر کا دماغ تجارت کی طرف مائل تھا۔ وہ کچھ اور کاروبار بھی کرتے رہتے تھے۔ اس طرح انھوں نے اولاد کی تعلیم و تربیت اور خاندان کی پرورش کی“

(دوسرے فروش شاعر: رام پرشاد لہلہ اور اشفاق اللہ خاں حسرت، صفحہ ۲۷)

وقار صدیقی دونوں وطن کے شیدائیوں میں یکسانیت بتاتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ دونوں اپنی والدہ کے بھی شیدائی تھے۔ دونوں ہی کی والدہ بڑی دلیر، حباں باز اور بہادر تھیں۔ مثلاً جب رام پرشاد کو پھانسی کی سزا ملنے والی تھی، تب ان کی والدہ بیٹے سے آحسری ملاقات کے لئے گئیں تو بیٹے کو روتا دیکھ کر ماں کے جواب سے، اُن کی بے باکی، وطن پرستی اور بہادری کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کا ذکر وقار صدیقی

اس طرح کرتے ہیں:

”یہ کیا بزدلی دکھا رہے ہو میں تو بڑے فخر سے سراونچا کر کے آئی تھی کہ میری کوکھ نے ایسے بہادر کو جنم دیا ہے جو ملک کی آزادی کے لئے بیرونی سرکار سے لڑ رہا ہے۔ مجھے ناز تھا کہ میرا بیٹا اس سرکار سے بھی نہیں ڈرتا جس کے راج میں سورج غروب نہیں ہوتا اور تم ہو کہ رو رہے ہو۔ اگر پھانسی کا ڈرتھا تو اس راستے پر قدم ہی کیوں رکھا تھا“

(دوسرے فروش شاعر: رام پرشاد لہلہ اور اشفاق اللہ خاں حسرت، صفحہ ۵۶)

اسی طرح اشفاق اللہ خاں نے فیصلہ سنائے جانے سے قبل جو خط اپنی والدہ کی خدمت میں تحریر کیا تھا، اس خط سے اشفاق اللہ کی ہمت اور جو انمردی کی مثال ہے۔ ایک انقلابی بیٹے کا ماں کو لکھا گیا یہ خط دل پر گہرا اثر چھوڑ جاتا ہے۔ اشفاق نے اپنی ماں کو لکھا کہ:

”جنابہ والدہ صاحبہ!

بخیریت ہوں اور جنابہ کی خیریت کا خواہاں ہوں۔

کل فیصلہ سنایا جائے گا۔ خدا مجھ کو ہمت، طاقت اور اطمینان دے۔ سکون قلب عطا فرمائے۔ آپ سب کو صبر دے۔ بی بی دنیا سرائے فانی ہے۔ یہاں کون رہا ہے اور کون رہ جائے گا آدم سے آج تک زیست کا سلسلہ چلا جا رہا ہے اور چلا جائے گا۔ کہاں تک غم، کہاں تک رنج کیا جائے۔ مجھے اپنی سزا کا کوئی رنج نہیں۔ سزائے موت، سزائے قید یا کوئی اور بھی ہو۔

میرا ایمان ہے کہ سب منجانب اللہ ہوگا۔ پھر سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں

آئے، مگر جو دکھ ہے وہ تمہاری ضعیفی کا ہے۔ تکلیف ہے وہ تمہاری کمزور اور قابل رحم حالت پر۔۔۔

کاش! کہ خدا ایک موقع اور عطا کرتا کہ آپ کی خدمت کروں اور قدموں سے جدا نہ ہوں۔ خیر، خدا کی مرضی یہ ہی تھی۔ آپ بھی صبر کیجئے اور میرے لئے دعا کیجئے۔ آپ کو ضعیفی میں جو مجھ سے دکھ پہنچا، خدا انھیں آپ معاف فرمائیے گا۔ تب میرے دل کو تسکین حاصل ہوگی۔

آپ کا خادم  
اشفاق اللہ وارثی“

(دوسرے فروش شاعر: رام پرشاد بھٹل  
اور اشفاق اللہ خاں حسرت، صفحہ ۱۲۵ تا ۱۲۶)  
اسی طرح مذکورہ کتاب سیاسی و تاریخی تحقیق کا اچھا نمونہ ہے۔ مثلاً اشفاق اللہ خاں بچپن ہی سے انقلابی تحریک سے متاثر تھے۔ اپنی خودنوشت میں یوں رقم طراز ہیں:  
”کبھی کبھی بنگالی بھوں کا حال سنئے تھے تو دل میں خواہش پیدا ہوتی تھی کہ ہم بھی ایسے ہی ہوتے۔ مگر یہ معلوم نہ تھا کہ ایک دن ہم بھی کنہیات اور خودی رام بوس کی طرح پھانسی کی کوٹھری میں بند ہوں گے“

(دوسرے فروش شاعر: رام پرشاد بھٹل اور  
اشفاق اللہ خاں حسرت، صفحہ ۱۲۵)

انگریزوں کے لحاظ سے وہ دونوں شاعر باغی تھے لیکن ہمارے لئے وطن کے شہیدائی ہیں۔ ایسا بھی نہیں کہ وقار صدیقی نے مبالغے سے کام لیا ہے، بلکہ جو سچ ہے، اسے ہی بیان کیا ہے۔ گویا تحقیق کا جو اسلوب ہونا چاہئے، اس کتاب میں برقرار ہے۔

جس طرح کسی بھی شاعر کی شاعری سے اس کے عہد کی عکاسی ہوتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح رام پرشاد بھٹل اور اشفاق اللہ خاں حسرت کی شاعری بھی اپنے دور کی آئینہ دار ہے۔ دونوں ہی محب وطن تھے۔ اس لئے دونوں کی شاعری حب الوطنی سے لب ریز ہے۔ اس ضمن میں چند مثالیں ذیل میں پیش کی جا رہی ہیں:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے  
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے  
مذکورہ غزل جو کہ رام پرشاد بھٹل سے منسوب ہے لیکن اہل تحقیق اس بات سے متفق نہیں ہیں کہ یہ غزل رام پرشاد بھٹل کی ہے۔

”رام پرشاد بھٹل کی یہ غزل یا اس کے کچھ اشعار محققین کے مطابق سید محمد حسن بھٹلؒ عظیم آبادی کا نتیجہ فکر ہو سکتے ہیں لیکن بھٹلؒ کی شہادت کے سٹاسی (۸۷) سال بیت جانے کے بعد بھی عام ہندوستانی اسے بھٹلؒ (رام پرشاد بھٹل) کی ہی تخلیق تسلیم کرتا ہے کیوں کہ یہ غزل شہید وطن رام پرشاد بھٹلؒ کے نام پر ہی زیب دیتی ہے“  
(دوسرے فروش شاعر: رام پرشاد بھٹل اور  
اشفاق اللہ خاں حسرت، صفحہ ۸۱)

رام پرشاد بھٹل کے مزید اشعار اس طرح ہیں:  
زخم کھا کر بھی اسے ہے، زخم کھانے کی ہوس  
حوصلہ کتنا ترپنے کا ترے بھٹل میں ہے  
....

کیا ہوا گر مٹ گئے اپنے وطن کے واسطے  
بلبلیں قربان ہوتی ہیں چمن کے واسطے  
....

وطن کے واسطے ہم لاکھ تکلیفیں اٹھائیں گے  
ضرورت گر پڑی تو جان پر بھی کھیل جائیں گے

اسی طرح اشفاق اللہ خاں حسرت کے وطن پرستی اور وطن دوستی سے متعلق چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کبھی وہ دن بھی آئے گا جب اپنا راج دیکھیں گے  
جب اپنی ہی زمیں ہوگی، جب اپنا آسمان ہوگا  
....

وطن ہمارا رہے شاد کام اور آباد  
ہمارا کیا ہے، اگر ہم رہے، رہے نہ رہے  
....

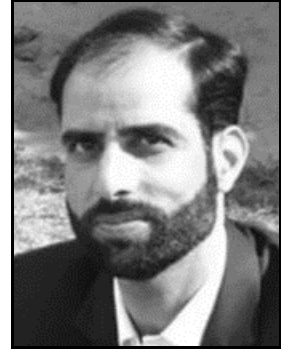
سبھی سامان عشرت تھے، مزے سے اپنی کٹی تھی  
وطن کے عشق نے ہم کو، ہوا کھلوائی زنداں کی  
غرض کہ یہ کتاب ادب اور زندگی کے مختلف شعبوں سے وابستہ ہے۔ سوانح، شخصیت، شاعری، سیاست، تحریک آزادی، تحقیق اور تاریخ سے اس کا رشتہ ہے۔ اردو دنیا میں یہ پہلا ایسا کام ہے، جس میں دو مجاہدین آزادی کی خدمات، کارنامے اور شاعری کو یک جا کر دیا گیا ہے۔ مصنف کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے دو ایسی شخصیات کی تحقیق کی، جن کی مادری زبان اردو ہے۔ تخلیقات کا دائرہ کار بھی اردو ہے۔ اردو زبان و ادب کے ذریعے ہی یہ شخصیات ایک دوسرے کے نزدیک آئی ہیں۔ گویا ہندوستان میں قومی یکجہتی کی شمع روشن کرنے کے لئے اردو زبان ہی بہترین ذریعہ ہے۔ مذکورہ کتاب اس معنی میں بھی اہمیت کی حامل ہے کہ جو لوگ تحریک آزادی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ جدوجہد سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ یہ کتاب ایسے سوالوں کا بھرپور جواب ہے نیز تحقیق و تاریخ کے ساتھ قومی یکجہتی کی مثال ہے۔

□□□

جون ۲۰۱۹ء تا اگست ۲۰۱۹ء

# کرشن چندر کے مشہور افسانہ ’مہاشمی کا پل‘ کا تجزیاتی مطالعہ

کرشن چندر بیسویں صدی کے ایک ممتاز اور مقبول و معروف افسانہ نگار ہیں۔ اگر کرشن چندر کو اردو افسانہ نگاری کا شہنشاہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کرشن چندر کی افسانہ نگاری کا مطالعہ مطلب پوری ایک صدی کا مطالعہ کرنے کے مترادف ہے۔ اسے حسن اتفاق کہیے یا خدا کی کرامت کہ کرشن چندر نے بیسویں صدی کے بیشتر اہم اور معتبر افسانہ نگاروں کے عہد میں جنم لیا۔ کرشن چندر نے انہی کے دوش بہ دوش کہانیاں لکھیں اور انہی کے درمیان اپنی ایک انفرادیت اور شناخت قائم کی۔ ان کے معاصرین میں، حیات اللہ انصاری، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ کرشن چندر کے تقریباً تمام اہم معاصرین کا افسانوی رنگ انفرادی تھا۔ خود کرشن چندر نے بھی افسانوی دنیا میں اپنی ایک منفرد راہ اختیار کی۔ ان کا ایک مخصوص نقطہ نظر تھا، جس کی وہ ہمیشہ پیروی کرتے رہے۔ وہ ترقی پسند تحریک کے حامی تھے لیکن ان کے افسانوی موضوعات سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ترقی پسند تحریک کے دائرے میں مقید نہ رہ کر سماج، معاشرے اور زندگی سے متعلق متنوع موضوعات کو اپنے افسانوں میں برتا۔ ان کے معاصرین میں کسی نے جنس اور نفسیات کو اپنا موضوع بنایا تو کسی نے دیہات کی زندگی کو اپنی افسانوی دنیا کا شعار بنالیا، کسی نے شہری زندگی کو افسانوں کا موضوع بنایا تو کسی نے رومانی کہانیاں لکھیں۔ کرشن چندر کی بھی بہت سی کہانیاں رومانیت سے مزین ہیں۔ تاہم انھوں نے سماجی حقیقت نگاری سے ممیز افسانے بھی لکھے۔ اس طرح کرشن چندر کے یہاں رومان اور حقیقت کا بہترین امتزاج نظر آتا ہے۔ کرشن چندر نے درجنوں افسانوی مجموعے یا دگڑھ چھوڑے اور تین سو کے قریب افسانے تخلیق کیے ہیں۔ ان کے افسانوں میں بعض افسانے شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں جو پہلے بھی موضوع بنائے گئے اور آج بھی ان کی انفرادیت اپنی جگہ برقرار ہے۔ کرشن چندر کو جن افسانوں کی بدولت شہرت عام و بقائے دوام حاصل ہوئی ان میں ”کالو بھنگی“، ”دو فر لانگ لمبی سڑک“، ”ان داتا“، ”پشاور ایکسپریس“، ”آدھے گھنٹے کا خدا“، ”پورے چاند کی رات“، ”موبی“، ”ہم وحشی ہے“، ”مہاشمی کا



غلام نبی کمار

چھوڑی شریف، کمار محلہ،

بڈگام، جموں و کشمیر

رابطہ: 7053562468

پل“ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہاں پر آخر الذکر افسانہ ”مہالکشی کا پل“ کا تجزیہ مقصود ہے۔

”مہالکشی کا پل“ کرشن چندر کا ایک

بہترین افسانہ ہے۔ اس افسانے میں متوسط طبقے کے خاندانوں کو نہیں بلکہ اُس سے بھی نیچے سطح کی زندگی گزارنے والے کئی خاندانوں کی زندگیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ”مہالکشی کا

پل“ کا بنیادی موضوع غربت، بھوک،

استحصال، ظلم، جبر، نا انصافی، ڈر اور احتجاج

ہے۔ اس افسانے میں کرشن چندر نے غربت،

مفلسی اور پسماندگی کی خوبصورت تصویر کشی کی

ہے جو مہالکشی کے پل کے اس پار رہنے والے

لوگوں کی تقدیر بن چکی ہے، مہالکشی کے پل

کے اس پار چھوٹی چھوٹی گندی جھونپڑیوں میں وہ

لوگ رہ رہے ہیں جو بہت ہی مفلوک الحال زندگی

گزر بسر کر رہے ہیں۔ جب کہ اسی پل کے اُس

پار بڑے بڑے سرمایہ دار لوگوں کے اونچے

اونچے عالی شان مکان ہیں جہاں وہ خوشحالی اور

شادمانی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کرشن

چندر نے امیروں اور غریبوں کے درمیان دیوار

کی مانند حائل ”مہالکشی کا پل“ کے اوپر بائیں

طرف لوہے کے جنگلے پر لہرا رہی چھ ساڑھیوں کو

افسانے کا مرکزی محور بنایا ہے۔ یہ ساڑھیاں

وہاں مہالکشی کے پل کے اس پار قریب ہی

بائیں طرف آٹھ نمبر کی چال میں رہنے والی

عورتوں نے سوکھنے کے لیے رکھی ہوتی

ہیں۔ افسانہ نگار نے راوی کے ذریعے ان

ساڑھیوں کو پہننے والی عورتوں کی وہ درد و وحشت

ناک کہانی بیان کی ہے جو اس افسانے کی کامیابی

کی اہم وجہ بنی ہے۔ اس افسانے کا راوی کسی

امیر بستی یا گھرانے سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ وہ بھی

انہی عورتوں کی طرح اسی چال میں اپنے اہل

خانہ کے ساتھ ایک عام انسان کی طرح زندگی

کے بہت ہی بُرے اور کرب ناک حالات کا

سامنا کر رہا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مہالکشی

کے پل پر سوکھنے کے لیے رکھی گئی ساڑھیوں کے

پہننے والوں کی زندگی سے اچھی طرح واقف ہوتا

ہے۔ یہ ساڑھیاں راوی کی توجہ کا مرکز اس لیے

بنتی ہیں کہ اُس دن وہاں سے ملک کے وزیر

اعظم کی گاڑی کو گزرنا ہوتا ہے۔ راوی کے ذہن

میں یہ خیال جنم لیتا ہے کہ شاید وزیر اعظم کی نظر

ان ساڑھیوں کی طرف پڑے اور وہ ان کے

پہننے والوں کی حالت زار کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

لیکن وزیر اعظم کی نظر تو درکنار بلکہ اُن کی گاڑی

مہالکشی کے پل کو چیرتے ہوئے اس طرح پار

کر لیتی ہے کہ جیسے چال کی غلاظت سے پھیلی

بدبو ان تک بھی پہنچ گئی ہو اور اُن کو یہ احساس ہوا

ہو کہ وہاں رکنا وبالِ جان کے برابر ہوگا۔ اس

طرح چال میں رہ رہے مصیبت اور قسمت کے

مازوں کی بد نصیبی یہاں بھی ان کا ساتھ نہیں

چھوڑتی ہے۔

مہالکشی کے پل پر لہرا رہی ان چھ

ساڑھیوں کو چال میں رہنے والی وہ عورتیں پہنتی

ہیں جن کی روداد راوی بہت ہی مؤثر انداز میں

بیان کر رہا ہے۔ راوی نہ صرف ان ساڑھیوں

کے رنگوں سے واقف کراتا ہے بلکہ وہ ان کا نقشہ

اس طرح کھینچتا ہے کہ جیسے وہ ساڑھیاں ٹھیک

ہماری ہی آنکھوں کے سامنے لہرا رہی ہو اور اُن کا

سب کا حال ہماری ذات پر صاف عیاں ہو رہا

ہو۔ افسانے کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں، اس

سے آپ ان ساڑھیوں کے بارے راوی کی

زبانی مزید جان سکتے ہیں:

”پل کے اس طرف ہمیشہ اس مقام

پر چند ایک ساڑھیاں لہراتی رہتی ہیں۔ یہ

ساڑھیاں کوئی بہت قیمتی نہیں ہیں۔ یہ لوگ

یہاں ہر روز ان ساڑھیوں کو دھو کر سوکھنے کے

لیے ڈال دیتے ہیں اور ریلوے لائن کے

آر پار جاتے ہوئے لوگ، مہالکشی اسٹیشن پر

گاڑی کا انتظار کرتے ہوئے لوگ، گاڑی کی

کھڑکی اور دروازوں سے جھانک کر باہر

دیکھنے والے لوگ اکثر ان ساڑھیوں کو ہوا

میں جھولتا ہوا دیکھتے ہیں۔ وہ ان کے مختلف

رنگ دیکھتے ہیں۔ بھورا، گہرا بھورا، مٹ میلا

نیلا، قرمزی بھورا، گنداسرخ کنارا، گہرا نیلا

اور لال۔ وہ لوگ اکثر انھیں رنگوں کو فضا میں

پھیلے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ایک لمحے کے لیے،

دوسرے لمحے میں گاڑی پل کے نیچے سے

گزر جاتی ہے۔“

اس اقتباس سے قاری ان ساڑھیوں

کے رنگوں اور ان کے حال و احوال سے واقف

ہوتا ہے۔ راوی کے مطابق ان ساڑھیوں کا

رنگ اب جاذبِ نظر نہیں رہا، ممکن ہے کسی

زمانے جب یہ خریدی گئی ہوں ان کے رنگ

خوبصورت اور چمکتے ہوئے ہوں۔ لیکن روز روز

کے دھوئے جانے اور استعمال کی وجہ سے ان کی

آب و تاب مرجی ہے۔ ان ساڑھیوں کی

موجودہ حالت ان کے پہننے والی عورتوں کی مفلسی

اور کمپرسی کا جیتا جاگتا ثبوت فراہم کرتی

ہیں۔ افسانہ ”مہالکشی کا پل“ میں کرشن چندر

نے زندگی کی ایک تلخ ترین حقیقت کو اجاگر کیا

ہے۔ ہمارے معاشرے کے عصری منظر نامے

سے ان حالات کا تقابل کیا جائے تو حالات

جوں کے توں ہی ہیں۔ ہمارے ملک میں ایسی

ہی آج بھی بے شمار بستیاں ہیں جو سیاست اور سرمایہ داروں کی غفلت شعاری اور ظلم و جبر کی شکار نظر آتی ہیں۔

ان چھ ساڑھیوں میں پہلی ساڑھی بھورے رنگ کی ہے جو شاننا بائی کی ہے۔ شاننا بائی برتن مانجنے کا کام کرتی ہے۔ اس کے تین بچے ہیں۔ بڑی لڑکی چھ برس کی ہوگی، اور دو چھوٹے لڑکے ہیں۔ اس کا خاوند سیون مل کے کپڑے کھاتے ہیں کام کرتا ہے۔ راوی بتاتا ہے کہ کیسے اور کس مشکل سے شاننا بائی اپنے بچوں، اپنے شوہر اور اپنے گھر بھار کی دیکھ بال کے علاوہ لوگوں کے گھروں میں کام کاج کرتی ہے۔ راوی شاننا بائی کی تنگ دستی، اس کی کرب آمیز زندگی اور اس کی اکلوتی ساڑھی جو اس کو ہر سات مہینے میں بدلی پڑتی ہے، کیونکہ وہ ساڑھی سات مہینے کے اندر ہی تارتا رہنا شروع ہو جاتی ہے، ہر سات ماہ بعد اس کو نئی ساڑھی پانچ روپے چار آنے میں خریدنی پڑتی ہے۔ شاننا بائی اور اس کے خاوند کی کمائی اتنی قلیل ہے کہ اس سے ان کے اور ان کے بچوں کا پیٹ بھی نہیں بھرا جاتا۔ اب اس کی چھ سال کی بیٹی بھی برتن مانجنے کے کام میں اس کی مدد کرتی ہے۔ شاننا بائی کی ساڑھی کا رنگ بھورا اس لیے ہے کہ وہ کپڑا جلدی میلا یا گندا نہیں ہوتا۔ پھر بھی وہ اس کو روز روز دھوتی ہے اور پھر سوکھنے کے لیے پل پر چھوڑ جاتی ہے۔ اس دوران گھر پر کام کرتے وقت وہ ایک گندی، غلیظ اور پھٹی ہوئی ساڑھی پہن کر کام کرتی ہے۔ افسانے میں راوی نے شاننا بائی کے وہ سہانے اور شوخ دن بھی یاد کیے جب وہ اپنے اپنے ماں باپ کے ساتھ سکھ چین کی زندگی بسر کر رہی تھی، اس کے پاس کھانے کی

چیزوں اور کپڑوں کی کمی نہ تھی، مگر شادی کے بعد کھانے کے لالے پڑ گئے اور کپڑوں کے لیے آنکھیں ترستی ہی رہیں۔ اس کہانی میں نہ محض

”مہاکشی کا پل“ کے دیگر پانچ ساڑھیوں کو پہننے والی عورتوں کی حالت شاننا بھائی سے اور بھی خستہ ہے۔ اُن کی حالت کو ایسے بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ کیڑے مکوڑے کی طرح جیتے اور سسک سسک کر مر جاتے ہیں۔ شاننا بائی کی کھولی میں سب ہی لوگ انتہائی غلیظ ماحول میں زندگی گزار رہے ہوتے ہیں اور آج تک کسی نے بھی نہ تو ان کی حالت زار پر افسوس کا اظہار کیا اور نہ ہی ان پر ترس کھایا۔ دوسری ساڑھی جیونا بائی کی ہے جو گہرے بھورے رنگ کی ہے۔ اس کی ساڑھی کا رنگ شاننا بائی کی ساڑھی سے بھی پھیکا ہے۔ اس کی قیمت بھی پانچ روپے چار آنے ہی ہے، لیکن یہ ساڑھی نہایت ہی بوسیدہ حالت میں ہے۔

جیونا بائی بیوہ ہے، اس کا شوہر بھی مل میں کام کرتا تھا جس کو کمزوری اور ضعیفی کی وجہ سے مل سے نکال دیا گیا تھا، اس روز جیونا بائی اور اس کے خاوند ڈھونڈ و کے درمیان ہاتھ پائی بھی ہوئی تھی جس کے بعد سے جیونا بائی ایک آنکھ سے کانی ہو گئی۔ جیونا بائی کو اس بات کا قطعی افسوس نہ تھا کیونکہ اس نے غربت ہی میں سہی ڈھونڈ و کے ساتھ تیس برس کی شادی شدہ زندگی گزاری تھی۔ پینتیس سالہ ملازمت سے برطرف کیے جانے پر وہ اُس دن نشے میں تھا اور لڑائی جھگڑے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ فیکٹری مالک کو اس کی بیماری کا پتہ چلتا ہے تو جبراً اس کو فیکٹری کی ملازمت سے نکال دیا جاتا ہے۔ یہاں بھی سرمایہ داروں کے استحصال سے چال کا ایک اور خاندان تباہ و برباد

شاننا بائی کا المیہ بیان کیا گیا ہے بلکہ یہاں پر فیکٹریوں سے نکلنے اور بننے والے کپڑے اور

اس کے مالکان پر بھی طنز آمیز جملے کسے گئے ہیں۔

”مہاکشی کا پل“ کے دیگر پانچ ساڑھیوں کو پہننے والی عورتوں کی حالت شاننا بائی سے اور بھی خستہ ہے۔ اُن کی حالت کو ایسے بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ کیڑے مکوڑے کی طرح جیتے اور سسک سسک کر مر جاتے ہیں۔ شاننا بائی کی کھولی میں سب ہی لوگ انتہائی غلیظ ماحول میں زندگی گزار رہے ہوتے ہیں اور آج تک کسی نے بھی نہ تو ان کی حالت زار پر افسوس کا اظہار کیا اور نہ ہی ان پر ترس کھایا۔ دوسری ساڑھی جیونا بائی کی ہے جو گہرے بھورے رنگ کی ہے۔ اس کی ساڑھی کا رنگ شاننا بائی کی ساڑھی سے بھی پھیکا ہے۔ اس کی قیمت بھی پانچ روپے چار آنے ہی ہے، لیکن یہ ساڑھی نہایت ہی بوسیدہ حالت میں ہے۔ جیونا بائی بیوہ ہے، اس کا شوہر بھی مل میں کام کرتا تھا جس کو کمزوری اور ضعیفی کی وجہ سے مل سے نکال دیا گیا تھا، اس روز جیونا بائی اور اس کے خاوند ڈھونڈ و کے درمیان ہاتھ پائی بھی ہوئی تھی جس کے بعد سے جیونا بائی ایک آنکھ سے کانی ہو گئی۔ جیونا بائی کو اس بات کا قطعی افسوس نہ تھا کیونکہ اس نے غربت ہی میں سہی ڈھونڈ و کے ساتھ تیس برس کی شادی شدہ زندگی گزاری تھی۔ پینتیس سالہ ملازمت سے برطرف کیے جانے پر وہ اُس دن نشے میں تھا اور لڑائی جھگڑے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ فیکٹری مالک کو اس کی بیماری کا پتہ چلتا ہے تو جبراً اس کو فیکٹری کی ملازمت سے نکال دیا جاتا ہے۔ یہاں بھی سرمایہ داروں کے استحصال سے چال کا ایک اور خاندان تباہ و برباد

ہے تو اس کے شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے۔ پھر جیونا بانی کی زندگی کیسے عذاب میں گزرتی ہے، راوی اس کا شاہد ہے جو اس دردناک واقعے کا حال ہم تک پہنچا رہا ہے۔ جیونا کی ایک بیٹی تھی جو جوان ہونے کے بعد کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ آخر میں اسے پتہ چلتا ہے کہ وہ فارس روڈ پر دھندا کرتی ہے۔ اب بڑھاپے میں جیونا بانی کے لیے اس سے زیادہ تکلیف دہ بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ جیونا بانی نے نہایت مفلسی میں زندگی گزاری تھی مگر اتنا شرمناک کام کبھی نہ کیا تھا۔

تیسری ساڑھی کا رنگ مٹ میلا نیلا ہے جو راوی کی بیوی کی ساوڑی کی ساڑھی ہے۔ راوی چونکہ خود اسی چال میں ایک عذاب بھری زندگی گزار رہا ہوتا ہے اسی لیے ان تمام ساڑھیوں کی عورتوں کی زندگیوں کو بیان کرتے کرتے اس پر جذبات اور غم کا سیلاب اُٹھاتا ہے۔ راوی تعلیم یافتہ ہوتا ہے یعنی دسویں پاس ہے اس لیے وہ فیکٹری میں کلرک کی نوکری پر مامور ہوتا ہے۔ اس کی تنخواہ پینسٹھ روپے ہوتی ہے جو عام مزدوروں کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے۔ تاہم اپنی تنخواہ سے وہ اپنے بال بچوں کا بھی شکم نہیں بھر پاتا کیوں کہ اس کے آٹھ بچے ہیں جو کسی پاٹھ شالہ میں نہیں پڑھتے، کیونکہ ان بچوں کے باپ کے پاس ان کے پڑھانے کی فیس نہیں ہے اس کی پوری تنخواہ آدھے مہینے ہی میں راشن پانی میں خرچ ہو جاتی ہے، باقی مہینے کا خرچ ساہوکار کے ادھار پر چلتا ہے۔ راوی اپنی دکھ بھری زندگی کی جو داستان بیان کرتا ہے اسے ایک قاری یقیناً غم اور جذبات کی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے۔

چوتھی ساڑھی قرمزی رنگ کی ہے اور اس

میں بھورا رنگ جھلک رہا ہے۔ یہ ساڑھی جھبو بھئیے کی عورت لڑیا کی ہے۔ جس کا کوئی بچہ وچہ نہیں ہے۔ اس وجہ سے لوگ اس کو منحوس سمجھتے تھے۔ اس نے ایک طوطا پال رکھا تھا جس کو اپنی اولاد کی طرح پیار کرتی تھی، یہی طوطا بچے کی جگہ اس کا دل بہلایا کرتا تھا۔ جھبو کسی زمانے میں مراد آباد سے شہر آیا، اس کی پیسہ کما کر اپنے علاقے، خاندان اور ذات کی لڑکی سے شادی کرنے کی خواہش تھی، شہر سے گاؤں جانے پر اس کی چار سال کی کمائی خرچ ہو جاتی، اس لیے اس نے شہر ہی میں ایک بد معاش سے بات چیت کر کے اپنے لیے سو روپے میں بیوی خرید لی۔ جھبو کو اس وقت انتہائی مسرت ہوئی جب اسے پتہ چلا کہ جو بیوی وہ خرید کر لایا ہے وہ اس کے علاقے، خاندان اور ذات ہی کی ہے۔ ایک دن جھبو اپنے فیکٹری کے منیجر سے جھگڑا کرتا ہے، بدلے میں منیجر اس کی اپنے گنڈوں سے پٹائی کروا دیتا ہے۔ جھبو اس لڑائی میں زخمی ہو جاتا ہے اور وہ مرتے مرتے بچ جاتا ہے۔ اس مار سے وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔ بالآخر لڑیا گھر گھر گلی گلی ٹوکری سر پر رکھ کر بھاجی ترکاری بیچنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ افسانہ نگار نے یہاں پر بھی سرمایہ داروں کو مزدور طبقے پر استحصال کرتے دکھایا ہے اور ایک متاثرہ خاندان کی اذیت ناک زندگی کا خاکہ کھینچا ہے۔

پانچویں ساڑھی منجولا کی ہے۔ جس کا رنگ گدلا سرخ ہے لیکن کنار اگہرا نیلا ہے۔ یہ ساڑھی باقی ساڑھیوں سے بہتر ہے اور اس کا رنگ بھی نکھرا ہوا ہے۔ اس کی قیمت بھی باقی ساڑھیوں کی بہ نسبت زیادہ یعنی پونے نو روپے ہے۔ یہ ساڑھی منجولا کے بیاہ کی ہے۔ جس کو بیاہ

کیے ہوئے ابھی پچھ مہینے بھی نہیں ہوئے۔ اس کا خاوند مل کے چرنی کے گھومتے ہوئے بٹے کی لپیٹ میں آکر مارا گیا۔ منجولا سولہ برس کی ہے۔ منجولا نے مل والوں سے ہر جانے کی درخواست کی جو نا منظور ہوئی، اسے یہ کہہ کر رد کیا گیا کہ اس کا اپنی شوہر لا پرواہی سے مرا۔ منجولا کے پاس بیاہ کی اس ساڑھی کے علاوہ کوئی دوسری ساڑھی نہ تھی جو وہ پہن سکتی، بقول راوی ”جیسے یہ ساڑھی نہیں ہے۔ ایک گہری قبر ہے جس کی ہولناک پہنائیوں کو وہ ہر وقت اپنے جسم کے گرد لپیٹ لینے پر مجبور ہے۔ منجولا زندہ قبر میں گاڑی جا رہی ہے۔

چھٹی ساڑھی کا رنگ لال ہے۔ اس کی پہننے والی مرچکی ہے۔ راوی کہتا ہے یہ ساڑھی مائی کی ہے جو ہماری چال کے دروازے کے قریب اندر کھلے آنگن میں رہا کرتی تھی۔ سیتو اس کا بیٹا ہے جو جیل میں ہوتا ہے۔ سیتو کی بیوی، اس کی لڑکی اور بڑھیا مائی چال کے بھنگی ہیں۔ ان کی کوئی کھولی نہیں ہے۔ اس لیے یہ لوگ چال کے کھلے آنگن میں رہتے ہیں۔ اس ساڑھی میں جو سوراخ نظر آتا ہے دراصل وہ سوراخ گولی کا ہے۔ یہ کارتوس کی گولی مائی کو بھنگیوں کے ہڑتال کے دنوں میں لگی تھی۔ وہ اس ہڑتال کا حصہ نہ تھی، وہ تو بوڑھی تھی۔ اس کا قصور یہ تھا کہ وہ کھلے میں رہتی تھی اور گولی کو اپنا راستہ چاہیے جو اس کی ساڑھی اور اس کے سینے کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ مائی اسی دن رخصت ہوئی اور آج اُس کا بیٹا جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہے۔ یہ ساڑھی بڑھیا مائی کے ساتھ اس لیے نہیں جلائی گئی کہ وہ سیتو کی بیوی کا تن ڈھکنے کے کام آئے گی۔

مہالکشی کے بل پر سوکھنے کے لیے رکھی

گئی ان ساڑھیوں کو جو عورتیں پہنتی ہیں ان سب سے تو ایک قاری آشنا ہو جاتا ہے کہ یہ عورتیں قسمت کی ماری ہیں جو اپنی نصیب کو کوستی ہے۔ اس دنیا میں انھیں نہ خوشی کا سامان میسر ہو پایا اور نہ ہی یہ دنیا انھیں سخت عذات اور درد سے نجات دلانے میں کامیاب ہوئی۔ یہ المناک اور پُرسوز زندگی ان کے لیے موت سے بدتر تھی۔ جس میں وہ روز موت کو گھونٹ گھونٹ پیا کرتی تھیں۔ یہ کہانی صرف انہی چھ عورتوں کی نہیں ہے بلکہ ان کے پورے خاندان، ان کے بچوں اور چال میں رہنے والے ہر اُس شخص کی ہے جو انتہائی، دُکھ، تکلیف، درد اور اذیت ناک زندگی بسر کر رہے تھے۔

”مہالکشی کا پُل“ کی کہانی واحد متکلم جس خوبی سے قاری تک پہنچا رہا ہے، اس میں دراصل افسانہ نگار کا کمال پنہاں ہے۔ افسانہ نگار نے ایک ایسے کردار کو راوی بنا کر پیش کیا جو چال میں رہنے والے مصیبت زدہ لوگوں کی زندگی کا حصہ تھا، کیونکہ اس کی اسی چال میں گزر بسر ہو رہی تھی۔ کرشن چندر نے راوی کو مرکزی کردار کیوں بنایا؟ اس نے چال کے کسی دوسرے عام مزدور کو راوی یا مرکزی کردار بنا کر کیوں پیش نہیں کیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ راوی ہی اس چال میں اچھا پڑھا لکھا تھا، اس کی نوکری بھی ان سب سے بڑی تھی۔ سب سے بڑی خوبی اس میں یہ تھی کہ وہ اخبار پڑھ سکتا تھا، انگریزی میں درخواست لکھ سکتا تھا، وزیر اعظم کی تقریر کو سمجھ سکتا تھا، اس میں مشاہدہ کرنے اور ان مفلوک الحال مزدوروں کی بے بسی کو بیان کرنے کی صلاحیت تھی۔ ایک وجہ یہ بھی کہ وہ اچھی تنخواہ پا کر بھی کیوں اچھی اور خوشحال زندگی بسر نہ کر

سکا؟ ایک خاص وجہ یہ بھی تھی، کہ وہ فیکٹری میں آخر تک کام کرتا رہا اور اس نے وہاں چال کے مزدوروں خاص طور پر ان ساڑھیوں کی پہننے

چوتھی ساڑھی قرمزی رنگ کی ہے اور اس میں بھورا رنگ جھلک رہا ہے۔ یہ ساڑھی جھبو بھینے کی عورت لڑیا کی ہے۔ جس کا کوئی بچہ وچ نہیں ہے۔ اس وجہ سے لوگ اس کو منحوس سمجھتے تھے۔ اس نے ایک طوطا پال رکھا تھا جس کو اپنی اولاد کی طرح پیار کرتی تھی، یہی طوطا بچے کی جگہ اس کا دل بہلایا کرتا تھا۔ جھبو کسی زمانے میں مراد آباد سے شہر آیا، اس کی پیسہ کما کر اپنے علاقے، خاندان اور ذات کی لڑکی سے شادی کرنے کی خواہش تھی، شہر سے گاؤں جانے پر اس کی چار سال کی کمائی خرچ ہو جاتی، اس لیے اس نے شہر ہی میں ایک بدمعاش سے بات چیت کر کے اپنے لیے سو روپے میں بیوی خرید لی۔ جھبو کو اس وقت انتہائی مسرت ہوئی جب اسے پتہ چلا کہ جو بیوی وہ خرید کر لایا ہے وہ اس کے علاقے، خاندان اور ذات ہی کی ہے۔ ایک دن جھبو اپنے فیکٹری کے منیجر سے جھگڑا کرتا ہے، بدلے میں منیجر اس کی اپنے گندوں سے پٹائی کروا دیتا ہے۔ جھبو اس لڑائی میں زخمی ہو جاتا ہے اور وہ مرتے مرتے بچ جاتا ہے۔ اس مار سے وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔ بالآخر لڑیا گھر گھر گلی گلی نوکری سر پر رکھ کر بھاری ترکاری بیچنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ افسانہ نگار نے یہاں پر بھی سرمایہ داروں کو مزدور طبقے پر استحصال کرتے دکھایا ہے۔

والی عورتوں کے خاندنوں کو دیکھا تھا، وہ ان کی بے بسی اور سچائی کا گواہ خاص بن چکا تھا۔ کرشن

چندر نے اس کردار سے بھی کہانی کو وہ موڑ دیا جو اس کہانی کو ان کی دیگر کہانیوں سے منفرد مقام عطا کرتا ہے۔

کرشن چندر نے اس کہانی میں ان معصوم افراد کی بے بسی کا اجاگر کیا ہے جو ہمیشہ ہی سے سرمایہ داروں کے ہتھے چڑھتے آئے ہیں۔ نہ انھیں برابر اجرت دی جاتی ہے اور نہ ہی ان کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ جیسے کہ وہ اس دنیا کے مخلوق ہی نہیں ہیں۔ مزید برآں سیاست دانوں کی عدم توجہی بھی ان کی غربت اور افلاس کی وجہ خاص ہے۔ اس کہانی کی دلچسپی کا مرکز اس کا موضوع اور بیان ہے۔ اس کہانی کا ہر ایک کردار قاری پر اپنا ایک گہرا تاثر قائم کرتا ہے۔ ان کی کرداروں کی ایک خاصیت جو انھیں شہرت عطا کرتی ہے وہ یہ کہ اس کے ہر کردار کا جیتا جاگتا روپ ہے جو اسی سماج اور معاشرت کے پروردہ ہیں۔ ”مہالکشی کا پُل“ کا ہر کردار اپنا ایک وجود رکھتا ہے۔ اس کا یہی وجود اس کہانی کی تکمیل کا سبب بنتا ہے۔ واقعہ نگاری کی سطح پر بھی اس کہانی کا کوئی جوڑ نہیں۔ ہر واقعہ اپنے آپ میں مکمل اور مربوط ہے جو تسلسل کے ساتھ آگے بڑھتا ہے اور کہانی کو انجام تک پہنچا دیتا ہے۔ ”مہالکشی کا پُل“ کا اسلوب بہت مؤثر ہے جو کہانی کے اختتام تک قاری کو اپنی جاذبیت اور چاشنی سے آشنا کراتا ہے۔

”مہالکشی کا پُل“ کرشن چندر کا ایک بہترین افسانہ ہے جو بغیر پلاٹ کے ہے۔ اس میں انسانی نفسیات کا اچھا اور گہرا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

□□□

جون ۲۰۱۹ء تا اگست ۲۰۱۹ء



# بیانیہ اور اقبال کی شاعری

اقبال نے واقعاتی اور فطری شاعری کے تصور کی آبیاری کرتے ہوئے اُسے ایک تناور اور با آرد درخت بنادیا جس کی بنیاد اردو شعریات میں حالی نے رکھی تھی۔ اقبال کی شاعری واقعیت اور مثالیت کے امتزاج سے اُبھری ہے، جس نے فکر اور جذبے کی غیر معمولی وسعت اور گہرائی کو اپنے اندر سمولیا ہے۔ اقبال کی یہی واقعاتی اور فطری شاعری بیانیہ شاعری کی کسی قدر وسیع اصطلاح کے ذیل میں آ جاتی ہے۔ جہاں تک اردو میں بیانیہ شاعری کا تعلق ہے، اس کی بہت بڑی روایت اردو اور فارسی شاعری میں مثنوی کی صورت موجود رہی ہے۔ اقبال کی بیانیہ شاعری میں حکیم سنائی، مولانا روم، فردوسی اور نظامی منقطع نظر نہیں آتا ہے بلکہ انھوں نے اسے اپنی فن کا ایک اہم حصہ بنادیا۔ ایک طرف اُن کی وسعت نظر فارسی مثنوی نگاری کی پوری روایت کو محیط ہے، جس میں حکیم سنائی، مولانا روم، فردوسی اور نظامی وغیرہ شامل ہیں اور دوسری طرف اُن کے پیش نظر مغرب کی طویل نظمیں جیسے ڈائٹے کا طریقہ ایزدی، ملٹن کی فردوس گم گشتہ اور گوئے کا فاؤسٹ رہی ہیں۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ اقبال کے تخلیقی شعور میں دنیا کی تمام عظیم الشان بیانیہ شاعری رچی ہوئی تھی۔

بیانیہ شاعری بنیادی طور پر قصہ گوئی کی ہیئت میں ہوتی ہے۔ یہ نغماتی اور ڈرامائی عناصر سے مملو ہوتی ہے، جس میں کرداروں کی مدد سے ڈرامائی مکالموں اور آوازوں سے شاعرانہ آہنگ اور مخصوص تمثیلی نمونے کے ساتھ بیان واقعہ ہوتا ہے۔ اقبال کی بیانیہ شاعری پر بات کرنے سے قبل بیانیہ کے معنی و مفہیم سمجھ لینا از حد ضروری ہے۔ بیانیہ کی تعریف یوں کی گئی ہے:

A Narrative is a story, whether told in prose or verse, involving events, characters, and what the characters say and do. Some literary forms such as the novel and short story in prose, and the epic and romance in verse, are explicit narratives that are told by a narrator.

(A Glossary of Literary Terms, by M.H.Abrams, pp173)

جولن ۲۰۱۹ء تا اگست ۲۰۱۹ء



اولیس احمد بٹ

ریسرچ اسکالر، شعبہ اور

یونیورسٹی آف حیدرآباد، تلنگانہ

رابطہ: 7730866990

بیانیہ ایک ایسی کہانی ہے (منثور منظوم) جس میں واقعہ کا بیان ہوا اور کرداروں کی موجودگی کے ساتھ ساتھ اُن کے قول و فعل کا بھی پتا چلے۔ بیانیہ متن ایک ایسا متن ہے جس میں کہانی کا کوئی کہانی بیان کرتا ہے۔ اردو میں ممتاز شیریں نے بیانیہ کی تعریف یوں کی ہے: ”بیانیہ صحیح معنوں میں کئی واقعات کی ایک داستان ہوتی ہے۔ جو یکے بعد دیگرے علی الترتیب بیان ہوتے ہیں۔“ (بیانات، مرتبہ قاضی انضال حسین، ص ۵۳)

اسی طرح مٹس الرحمن فاروقی بیانیہ کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ”بیانیہ سے مراد ہر وہ تحریر ہے جس میں کوئی واقعہ (Event) یا واقعات بیان کیے جائیں۔“ (ایضاً، ص ۶۲)

اس ضمن میں ایک اہم ماہر بیانات ژرار ٹینٹ (Gerard Genette) اپنے ایک اہم مضمون ”Boundaries of Narrative“ میں بیانیہ کے حوالے سے یوں لکھتے ہیں:

Within the sphere of literature, narrative may be defined simply as the representation of a real or fictitious event or series of events by language, and more specially by written language

New Literary Histort, vol.8, No.1, Johns Hopkins

University Press, 976, pp1

بیانیہ تحریری زبان کے ذریعے حقیقی یا غیر حقیقی افسانوی واقعہ یا واقعات کے تسلسل کا نام ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ بیانیہ محض افسانوی ادب کے متون تک محدود نہیں ہے۔ اسی طرح کی رائے مٹس الرحمن فاروقی نے بھی دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”۔۔۔ بیانیہ میں یہ شرط نہیں ہے کہ اس میں جو واقعات بیان ہوں وہ لامحالہ فرضی ہوں۔۔۔ بیانیہ محض واقعات پر مبنی ہوتا ہے، عام اس سے کہ وہ واقعات فرضی ہیں یا حقیقی۔“ (بیانات، قاضی انضال، ص ۶۳)

اقبال کو بیانیہ شاعری میں بے مثال قدرت حاصل ہے۔ بہ الفاظ دیگر یوں کہا جاسکتا ہے کہ اقبال بیان واقعہ پر اچھی خاصی دسترس رکھتے ہیں۔ اُن کی بیانیہ شاعری کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ بیان واقعہ کو سپاٹ اور بے تہہ نہیں ہونے دیتے ہیں، جیسا کہ اردو میں بیانیہ شاعری کے حوالے سے کہا بھی گیا ہے کہ بیانیہ کی شاعری سپاٹ، سیدھی اور بے تہہ ہوتی ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری میں خارجی واقعیت کے بیان کو لطیف رمزیت اور معنوی گہرائی سے مملو کیا۔ حالاں کہ غزل کے بیانیہ پر یہ بھی ایک طرح کا الزام ہی ہے کہ اس کا بیانیہ سراسر داخلیت سے مملو ہوتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو شاعری کی ہر قسم ایک طرح کا بیان ہی ہوتی ہے، چاہے وہ داخلیت سے مملو ہے یا پھر خارجیت سے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ بیانیہ شاعری صرف فطرت کی نقالی کے مترادف ہے، جس کے ڈانڈے ارسطو کے تصور محاکات سے ملتے ہیں۔ لیکن اس محاکات کا دوسرا جز تخلیقی

اظہار بھی ہے۔ اس ضمن میں ارسطو نے لکھا ہے: ”ذریعہ ایک ہو، نمائندگی کا موضوع بھی ایک ہو، لیکن ممکن ہے شاعر بیانیہ کے ذریعہ نمائندگی کا عمل کرنے یا اپنے تمام کرداروں کو ہمارے سامنے حرکت و عمل کی صورت میں ڈرامائی طور پر پیش کرے۔“ (شعریات، ترجمہ مٹس الرحمن فاروقی، ص ۴۱)

اب یہ شاعر پر منحصر ہے کہ وہ بیانیہ کو محض محاکات تک محدود رکھے یا اُسے اپنے تخلیقی اظہار کا پیرایہ بنا دے۔ جب ہم اقبال کی بیانیہ شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اُن کا بیانیہ دو زمروں میں منقسم ہوا نظر آتا ہے۔ اول صورت واقعہ، جس میں محاکاتی عناصر شامل ہیں۔ اور دوم فطرت، جو کہ فضا بندی اور منظر آفرینی سے مملو بیانیہ شاعری ہے۔ بیانیہ شاعری چوں کہ ہر طرح کے بیان اور اظہار پر مشتمل ہے، لہذا اس میں صورت واقعہ کا بیان خود بہ خود آجاتا ہے۔ بیانیہ شاعری میں صورت واقعہ کو بیان کرنے میں کئی عوامل کارفرما ہوتے ہیں، لیکن وہ مرکب ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں اقبال کو صورت واقعہ کے بیان پر قدرت حاصل ہے۔ جس کی بہترین مثال بانگ درا کی نظم ”غلام قادر ہیلہ“ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کریں:

رہیلہ کس قدر ظالم، جفا جو، کینہ پرور تھا  
نکالیں شاہ تیوری کی آنکھیں نوک خنجر سے  
دیا اہل حرم کو قص کا فرمان ستم گر نے  
یہ انداز ستم کچھ کم نہ تھا آثار محشر سے  
بنایا آہ! سامان طرب بیدرد نے ان کو  
نہاں تھا حسن جن کا چشم مہر و ماہ و اختر سے  
رکھا خنجر کو آگے اور پھر کچھ سوچ کر لیٹا

تقاضا کر رہی تھی نیند گویا چشمِ احمر سے یہ مقصد تھا مرا اس سے کوئی تیور کی بیٹی مجھے غافل سمجھ کر مار ڈالے میرے خنجر سے مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر حمیت نام ہے جس کا گئی تیور کے گھر سے یہ نظم اقبال کے محاکاتی اور ڈرامائی طرز بیان کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں اُنھوں نے بیان واقعہ میں نفسیاتی گہرائی پیدا کر دی ہے۔ اس نظم میں اقبال نے نظم کے مرکزی کردار غلام قادر رھیلہ کی شخصیت، اندازِ گفتگو اور طرزِ عمل کی ڈرامائی تصویر کشی کی ہے۔ جہاں تک اقبال کے فطرت کے بارے میں رویے کا سوال ہے، تو اس ضمن میں وہ شاعرانہ اور حکیمانہ دونوں نوعیت کا ہے۔ اقبال کے یہاں بیانیہ شاعری میں فطرت کے ہر مظاہر قابلِ اعتنائیں ہیں بلکہ اس حوالے سے اُن کا رویہ انتخابی ہے۔ اُن کی بیانیہ شاعری میں فطرت کے حوالے سے تین بنیادی عناصر پائے جاتے ہیں یعنی فطرت پسندی، فطرت سے ہم آہنگی اور تسخیرِ فطرت۔ اُن کے بیان واقعہ میں فطرت کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ آبشار، دشت و دریا، دشت اور سمندر نیز موج، ساحل اور طوفان سے کہیں زیادہ اُن کا ذوقِ نظر کہساروں کے مشاہدے سے زیادہ بہتر از حاصل کرتا ہے، جس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ اُن کے مطابق کہسار مقاومت، محکومیت اور ارفعیت اور سب سے اہم اپنی ذات میں خود مکتبی ہیں۔ نظم کو ہمارا ہمالہ اس ضمن میں بہت اہم ہے۔ اس نظم میں اقبال نے کہساروں کے حسن و جلال کو نمایاں کیا ہے۔ مثال دیکھیں:

آتی ہے ندی فراز کوہ سے گاتی ہوئی  
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی

آئندہ سا شاید قدرت کو دکھلاتی ہوئی  
سنگِ رہ سے گاہ بختی، گاہ ٹکراتی ہوئی  
چھیڑتی جا اس عراقِ دل نشیں کے ساز کو  
اے مسافر، دل سمجھتا ہے تری آواز کو  
لیٹی شب کھلتی ہے آکے جب زلفِ رسا  
دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا  
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا  
وہ درختوں پر تفکر کا ساں چھایا ہوا  
کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر  
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر  
ہمالیہ کے علاوہ اسرارِ خودی میں بھی اس طرح کی مثالیں موجود ہیں۔ یعنی اقبال کی علاماتی معنویت میں جو ارتقا ہوا ہے وہ ظاہر ہے۔ ہمالہ کے ساتھ ساتھ کوہِ دماوند، الوند، کوہِ اُخم اور کوہِ طور کا ذکر بھی اقبال کی شاعری میں ملتا ہے۔ اسی طرح کے مناظرِ جاوید نامہ میں بھی ملتے ہیں۔ اب یہاں جو اقبال کی بیانیہ شاعری کی خصوصیت ہے وہ اُن کے بیانیہ کی تفصیل و اطناب پر پوری گرفت میں مضمر ہے۔ یعنی جہاں بیانیہ میں اختصار سے کام لینا ہوتا ہے وہاں بس اشاروں سے کام لیتے ہوئے اُس میں گہرائی پیدا کر دیتے ہیں اور جہاں فضا بندی اور منظر آفرینی میں تفصیل کی ضرورت رہتی ہے وہاں تفصیل ہی میں معنی خیزی پیدا کرتے ہیں۔

پہاڑوں کے دامن میں لالہ و گل کا کھلنا  
کوہساروں سے وابستہ تصورات میں سے اقبال کے تخیل کو سب سے زیادہ وجد میں لاتا ہے، جس سے اُنھیں ایک خاص نفسی بہتر از حاصل ہوتا ہے۔ گل لالہ کی سرخی کے بغیر دامنِ کوہسار کی تصور اقبال کے نزدیک گویا ناکمل رہتی ہے۔ مثال ملاحظہ کریں:

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دامن  
مجھ کو پھر نعموں پہ اُکسانے لگا مرغِ چمن  
پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار  
اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن  
برگ گل پہ رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح  
اور اس موتی کو چمکاتی ہے سورج کی کرن  
کوہ و دامن کا ایک مجموعی منظر جس میں چراغِ لالہ سے روشنی ہے، دراصل متحرک تصور آفرینی کے نقطہ نظر سے ایک مکمل تصور ہے۔ پس منظر میں مرغِ چمن کی نغمہ طرازی، مقامِ نظر ذرا اور قریب ہوا تو پھولوں کے پیکر اور ان کے رنگ بھی اُجاگر ہوئے۔ تصویر اور واضح اور قریب تر ہوئی تو برگ گل پر شبنم کا موتی دکھائی دیا جسے سورج کی کرن مزید چمکار رہی ہے۔ اس منظر سے ایسا لگتا ہے کہ باغ اور گلزار و خیاباں کے متعلقات میں گل لالہ اقبال کا محبوب ذہنی پیکر ہے۔ پیامِ شرق میں چند قطعات ”لالہ طور“ کے عنوان سے ہیں، اسی طرح ”لالہ“ کے عنوان سے ایک نظم بھی ہے۔ ساقی نامہ میں اقبال نے لالہ کو شہید ازل لالہ خونیں کفن کہا ہے اور بال جبریل کی نظم ”لالہ صحرا“ سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ لالہ اُن کے یہاں محبوب ترین تصور ہے۔ ایک مثال دیکھیں:

یہ گنبدِ مینائی، یہ عالمِ تنہائی  
مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی تنہائی  
بھٹکا ہو راہی میں، بھٹکا ہوا راہی تو  
منزل ہے کہاں تیری اے لالہ صحرائی  
خالی ہے کلیموں سے یہ کوہ و کمر ورنہ  
تو شعلہ سینائی، میں شعلہ سینائی  
کوہسار اور دشت و باغ کے بعد آبِ رواں میں اقبال کا بیانیہ نہایت ہی خوب نظر آتا

ہے۔ اس آب رواں سے اُن کی شاعری میں آبشار، جوئے تنک آب اور آب جو سے بڑھ کر دریا اور سمندر کم ہی بنتا ہے۔ نظم ایک آرزو میں اقبال فطرت سے ہم کنار ہونے کی بے پایاں خواہش کا اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آب رواں کی تصویر کشی یوں کرتے ہیں: صف باندھے دونوں جانب بوئے ہرے ہرے ہوں ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو ہو دل فریب ایسا کہسار کا نظارہ پانی بھی موج بن کر اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہو آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہوسبزہ پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو مذکورہ بالا مثالوں سے بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اقبال جب منظر آفرینی کی طرف مائل ہوتے ہیں تو اُن کا کوئی بھی نقش پارہ شاہکار سے کم درجے کا نہیں ہوتا ہے۔ اس ضمن میں موج اور دریا اقبال کے پسندیدہ استعارے اور علامات معلوم ہوتے ہیں۔ اس طرح اقبال کی بیانیہ شاعری میں فطرت اور اس کے مظاہر کا بیان خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اُن کی بیانیہ شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے معلوم ہو جاتا ہے کہ فطرت کہیں نقطہ آغاز ہے، کہیں نقطہ اختتام اور کہیں خیال کو تازہ دم کرنے کے لیے ایک راحت کا وقفہ۔ اقبال کی بیانیہ شاعری میں منظر آفرینی خارجیت کے تمام قرائن رکھتی ہے۔ اُن کے یہاں کوئی بھی منظر یا مظہر ایک زندہ اور سانس لیتی ہوئی حقیقت کے طور دکھائی دیتے ہیں۔ حالاں کہ اس بات سے انکار بھی ہے کہ یوں تو اقبال کی شاعری میں منظر آفرینی اور

فضا بندی کے حسن سے آراستہ ہے۔ لیکن چند مناظر یا مظاہر اس قدر اہم ہیں جو اقبال کی بیانیہ شاعری کی عمدہ مثالیں ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ بیانیہ شاعری اُن مناظر یا مظاہر پر ناز کر سکتی ہے۔

اس حوالے سے چند مثالیں پیش ہیں:  
خاموش ہے چاندنی قمر کی  
شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی

ہمالیہ کے علاوہ اسرار خودی میں بھی اس طرح کی مثالیں موجود ہیں۔ یعنی اقبال کی علاماتی معنویت میں جو ارتقا ہوا ہے وہ ظاہر ہے۔ ہمالہ کے ساتھ ساتھ کوہ دماند، الواند، کوہ اشم اور کوہ طور کا ذکر بھی اقبال کی شاعری میں ملتا ہے۔ اسی طرح کے مناظر جاوید نامہ میں بھی ملتے ہیں۔ اب یہاں جو اقبال کی بیانیہ شاعری کی خصوصیت ہے وہ اُن کے بیانیہ کی تفصیل و اطناب پر پوری گرفت میں مضمر ہے۔ یعنی جہاں بیانیہ میں اختصار سے کام لیتا ہوتا ہے وہاں بس اشاروں سے کام لیتے ہوئے اُس میں گہرائی پیدا کر دیتے ہیں اور جہاں فضا بندی اور منظر آفرینی میں تفصیل کی ضرورت رہتی ہے وہاں تفصیل ہی میں معنی خیزی پیدا کرتے ہیں۔

وادی کے نوا فروش خاموش  
کہسار کے سبز پوش خاموش  
فطرت بے ہوش ہو گئی ہے  
آغوش میں سب کے سو گئی ہے

.....  
حسن ازل کی ہے نمود، چاک ہے پردہ وجود  
دل کے لیے ہزار سود ایک نگاہ کا زیاں  
گرد سے پاک ہے ہوا، برگ نخل دھل گئے

ریگ نواح کا نظم نرم ہے مثل پر نیاں  
آگ بجھی ہوئی ادھر، ٹوٹی ہوئی طناب ادھر  
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں  
.....

شب سکوت افزا، ہوا آسودہ، دریا نرم سیر  
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویر آب  
جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفل شیر خوار  
موج مضطرب تھی کہیں گہرائیوں میں مست خواب  
اقبال کا بیانیہ البعدی ڈرامائی، بوقلموں اور مرکب ہوتا ہے۔ مظاہر، کردار اور واقعات کی خارجی صورت پذیری، داخلی محرکات اور تاثرات سے لبریز ہوتی ہے۔ اقبال کی ذات صورت حال میں شامل رہتی ہے گو کہ وہ بعض اوقات ڈرامائی علیحدگی پسند کرتے ہیں۔ بیانیہ میں صورت حال کی معنویت کو وہ کبھی کرداروں کی زبان سے اور کبھی خود اپنی طرف سے بحر اور ردیف و قافیہ کے انتخاب، آہنگ اور لہجے کے زیرو بم سے پیش کرتے ہیں۔ اس میں رمز و ایما، تفصیل و اطناب، آغاز و انجام، موڈ اور رفتار کے ساتھ ساتھ منظر و پیش منظر سے بھی بیانیہ کی صورت حال کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ اقبال بیانیہ کے تمام اجزاء و عناصر اور آئین و ضوابط ہر حال میں پیش نظر رکھتے ہیں اور وہ جس چیز سے چاہتے ہیں زیادہ اور جس سے چاہتے ہیں کم کام لیتے ہیں۔ ان معنوں میں وہ کامل ابلاغ کے شاعر ثابت ہوتے ہیں اور ابہام کو صرف فنی ضرورت کے تحت مناسب جگہ دیتے ہیں۔ اگر یوں کہا جائے تو شاید ہی بے جا ہوگا کہ اقبال بیانیہ شاعری کی طویل تاریخ میں ہومر، ڈانٹے اور فردوسی و نظامی کے ہم سخن اور ہم آئین ہیں۔

□□□

# اندھیروں کے مسافر

چند مسافر دنیا میں ایسے بھی ہیں جن کا سفر رات کی تنہائی میں شروع ہوتا ہے۔ جہاں کچھ لوگوں کے لیے رات خوف کا سبب ہے وہیں چند لوگوں کو رات محفوظ کرتی ہے۔ یہ ناول ایسے ہی اندھیروں کے مسافر کی داستان ہے۔ جن کے لیے چاندنی راتیں خطرہ کا سبب بنتی ہیں۔ ایسے ڈکیت جن کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔ ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں خانہ بدوش کی طرح گردش کرتے ہیں۔ جہاں ہلکی سی آواز بھی ان کو چوکنا کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ ایسے ہی اندھیروں میں ایک محبت بھی نمودار ہوتی ہے:

اے گھاٹی کے کالے پتھر  
میں پتھر کی صورت نہیں  
دل کی دھڑکن میں بسی  
خوشبو ہوں انگار ہوں  
میں پتھر کو موسم کروں  
میں وہ عورت پونم ہوں

احمد حسنین کا ناول ”اندھیروں کے مسافر“ ہارڈک اور پونم کی محبت کی داستان ہے۔ جو ذات پات کی دیواروں کے سبب بے بس پڑ جاتی ہے اور ایک نئی داستان جنم لیتی ہے۔

”شکلی نے اس کے معاشقہ کا ذکر چھیڑ دیا تو ہارڈک ابل پڑا۔ اس نے کہا پونم گوکہ ایک گاؤں کی رہنے والی تھی مگر رہتی ہاسٹل میں تھی۔ جم جانے سے اسے خاص لگاؤ تھا مجھے بھی باڈی بنانے کا بڑا شوق تھا۔ وہیں میری اور پونم کی دوستی ہوئی۔ میں نے جب معلوم کیا تو پتہ چلا کہ موج مستی کرنے والی آزاد خیال لڑکی ہے۔ اس میں عام لڑکیوں جیسی نسوانیت نہیں بلکہ نڈراور بے خوف ہو کر اپنے گاؤں سے شہر پڑھنے آ جاتی ہے۔ چار دن ہاسٹل میں تو تین دن گاؤں میں۔“



محمد رضوان خان

ریسرچ اسکالر  
شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

ہارڈک کا قصور صرف اتنا تھا کہ دلت طبقہ کا لڑکا تھا اور اسے پنڈت طبقہ کی پونم سے محبت کرنے کی بھاری قیمت چکانی پڑی۔ کھاپ پنچایت کے اشاروں پر ظلم ڈھانے والے بے لگام حملہ آور ہارڈک کی بے رحمی سے پٹائی کرتے ہیں۔

”ادھر پنچایت کے دبتکوں نے ہارڈک کو مارنے پیٹنے کے بعد یہ سوچکر چھوڑ دیا تھا کہ اب وہ مر چکا ہے۔ ہارڈک کو جب ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو ایک اسپتال میں پایا اس کی نگاہوں کے سامنے اندھیرا تھا۔ کئی دن گزر گئے اس سے ملنے کوئی نہ آیا۔ اس واقعہ کی خبر وہ اپنے بھائی کو بھی نہیں کر سکتا تھا۔“

ادھر پونم جو پنچایت کے ڈر سے بھاگنے میں کامیاب ہو گئی لیکن اس کو معلوم نہیں تھا اس کا یہ سفر اس کے لیے کتنا خطرناک ثابت ہوگا جان بچانے کے لیے اندھیروں کے مسافر کے ساتھ سفر شروع کرتی ہے۔ وہ مدد کے لیے جن کو پکارتی ہے وہ ایک ڈکیت نکلتے ہیں۔ شروع میں تو ان پر اعتبار کرنا مشکل تھا۔ پونم کو لگا کہ یہاں سے بھی بچ نکلتا مشکل ہے۔

”دودن اور دو راتیں ٹرک چلتا رہا۔ پونم کو ایک طرف اطمینان ہو گیا کہ پنچایت کے آدمی اب اس کا کچھ نہیں کر سکتے۔ مگر اسے یہ بھی فکر پریشان کر رہی تھی کہ یہ لوگ کون ہیں اور اسے کہاں لیے جا رہے ہیں۔ دوسرے دن رات میں جب ٹرک باندہ پہنچا تو ایک بند چیپ وہاں پہلے سے کھڑی ملی۔ پونم کو اب یہ اندازہ ہو چلا تھا کہ یہ ٹھیک لوگ نہیں ہیں۔ گھائی کو دیکھ کر اس کا

شک یقین میں بدلنے لگا تھا۔ یہ میں کہاں بھنس گئی۔ اگر میں انہیں چکما دیکر بھاگ جاؤں تو جاؤں گی کہاں۔ اسے اپنی بے بسی کا احساس ہوا۔“

پونم ایک سرغنہ کے ساتھ چل رہی تھی۔ اسے ان کے جال سے نکلنا مشکل نظر آرہا تھا۔ پونم کو معلوم نہیں تھا اب اس سفر کا انجام کیا ہوگا۔ ادھر پونم کی تلاش میں ہارڈک باندہ پہنچ جاتا ہے۔ یہ تلاش اسے کوٹھے کی گلیوں تک پہنچا دیتی ہے۔ جہاں پہنچ کر ہارڈک اور ارشاد کو احساس ہوتا ہے کہ زیادہ تر لڑکیاں زبردستی اس دلدل میں بھنسی ہوئی ہیں اور وہ چاہ کر بھی واپس نہیں نکل پاتی۔ ناول نگار نے معاشرہ کی اس حقیقت کو پیش کیا ہے کہ ایک شریف لڑکی کے لیے ایسی زندگی موت سے بھی بدتر ہے۔ جو پیشہ ور نہیں ہیں اور زبردستی اس نرک میں لائی گئی ہیں۔

”موہنی بائی کا مجرا سننے کے بعد ارشاد نے اس سے پوچھا۔

”کیا ادھر کوئی نئی لڑکی آئی ہے یا لائی گئی ہے۔“

موہنی بائی نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں“

”وہ کون ہے؟“ ارشاد نے پوچھا۔

”میں ہی ہوں“ اس نے دھیرے

سے کہا۔

”تم کہاں کی ہو؟“ ارشاد نے

پوچھا۔

”بھنجری کا پوروا کی“ اس نے اپنے

الٹھے بال سنوارتے ہوئے کہا۔

”تو کیا تمہاری مرضی کے خلاف تم

سے جسم فروشی کرائی جاتی ہے۔“

”ہاں“ اس نے بڑی بے بسی سے کہا۔

اسی طرح سے پھیل گھائی میں سیما پر بیہار، تپلی بائی، پھولن دیوی اور رینو وغیرہ کی بھی کچھ ایسی ہی کہانی ہے۔ جو ظلم اور زیادتیوں کا شکار رہی ہیں۔

موجودہ دور میں نوٹ بندی نے جہاں لوگوں کو پریشانیوں میں مبتلا کیا۔ وہاں کچھ لوگوں نے اس سے بہت فائدہ اٹھایا۔ نوٹ بندی کچھ لوگوں کے لیے پہاڑ کی طرح ٹوٹی جہاں ایک باپ شادی کی تیاری کے انتظام میں لگا ہے۔ لاکھوں کا کیش لے کر بیٹھا اور وہ نوٹ اس کے لیے محض کاغذ بن چکے ہیں اور ہارٹ اٹیک سے اس کی قیمت چکانی پڑی۔

”اس رات منظم طریقہ سے اس نے بینک مینجر کے گھر ڈاکا ڈالا تھا۔ جس نے پچیس لاکھ روپے کے پانچ سو کے پرانے نوٹوں کے بدلے میں پانچ لاکھ روپیہ کمیشن لے لئے تھے۔ بینک مینجر نہیں جانتا تھا کہ یہ بدنام ڈاکو شیر سنگھ کا پیسہ ہے۔ یہ لین دین بینک بند ہو جانے کے بعد خفیہ طریقہ سے ہوا تھا۔ کسی کو کان و کان خبر نہ ہوئی۔ لہذا اس لین دین سے بینک مینجر کی تجوری بھر گئی تھی گویا یہ نوٹ بندی کی اچھی سوغات تھی۔“

ناول نگار نے ڈکیتوں کے علاوہ نکسلیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

”نکسلی لڑاکے جانے کیسے جنگل جنگل ہوتے ہوئے مرزا پور تک آ چکے ہیں۔ یہ باغی ہیں الگ طرح کے ڈاکو حالات کے مارے اپنے حق کی خاطر لوٹ پاٹ اور بڑے بڑے جرم کریں پھر بھی انہیں دیش

دروہی نہیں کہا جاتا۔ نکسلی بھی اپنے حق کے لئے ہتھیار بند لڑائی لڑ رہے ہیں مگر سرکار انہیں ان کا حق دینے کے بجائے اپنے لئے چنوتی سمجھ کر دبانا چاہتی ہے۔“

ناول نگار نے جو بھی واقعہ پیش کیا ہے۔ اس میں توازن ہے۔ پلاٹ کی ترتیب اس طرح کی گئی ہے کہ کوئی واقعہ غیر ضروری نہیں معلوم ہوتا۔ اس میں ڈکیتوں کی زندگی پیش کی گئی ہے۔ تاریک جنگلوں کے مناظر پیش کئے گئے ہیں اس اندھیری دنیا میں بھی کچھ زندگی روشن ہے۔ ناول نگار نے جو زبان استعمال کی ہے وہ سادہ اور سلیس ہے۔ عہد حاضر کی زبان ہے جس کی رسائی قاری تک بہ آسانی ہو جاتی ہے۔ کردار کے اعتبار سے بات کی جائے تو ہارڈک پونم اور شیر سنگھ اہم کردار ہیں انہیں کے ارد گرد کہانی گھومتی رہتی ہے۔ شیر سنگھ ایک ایسا ڈاکیت ہے جو غریب پرور ہے لوٹ مار کر کے آدھا پیسہ غریبوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ وہ خود اپنے جذبات کا اظہار کچھ اس انداز میں کرتا ہے۔

”میں تمہاری نظر میں ایک بدنام ڈاکو ضرور ہوں۔ لیکن لوٹ پات قتل خون اور موت سے کھیلنا اس بیڑی کی زندگی کی شان ہے۔ بے شک میں ڈاکو ہوں لیکن بلات کاری نہیں اب تک سات بلائکار یوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا ہوں۔ اس علاقہ میں اب ایسی گھٹنائیں سننے کو نہیں ملتی ہیں۔ پونم سنو اگر میں بھی جوانی کے جوش میں آکر ہوش کھو بیٹھتا اور تمہارے ساتھ ویسا ہی کرتا تو بلائکاری کہلاتا اور ہوش آنے پر اپنی نظریں گر جاتا پھر شاید میں اپنا ہی خون کر دیتا۔“

شیر سنگھ کی یہی اچھائی پونم کے دل میں جگہ بنالیتی ہے۔ پونم ایک تعلیم یافتہ لڑکی تھی شیتل پور پنچ کر جو چور اچکوں اور جرائم پیشہ لیٹیروں کا گڑھ بنا ہوا تھا۔ جہاں پولیس بھی جانے سے کتراتے تھے۔ تعلیم کی مشعل جلاتی ہے یہاں تک کہ پیسوں کا لالچ دیکر بھی وہاں کے لوگوں کو پڑھاتی ہے اور وہاں کی جہالت دور کرنے کی کوشش کرتی ہے جس میں وہ کچھ حد تک کامیاب

موجودہ دور میں نوٹ بندی نے جہاں لوگوں کو پریشانیوں میں مبتلا کیا۔ وہاں کچھ لوگوں نے اس سے بہت فائدہ اٹھایا۔ نوٹ بندی کچھ لوگوں کے لیے پہاڑ کی طرح ٹوٹی جہاں ایک باپ شادی کی تیاری کے انتظام میں لگا ہے۔ لاکھوں کاکیش لے کر بیٹھا اور وہ نوٹ اس کے لیے محض کاغذ بن چکے ہیں اور ہارٹ اٹیک سے اس کی قیمت چکانی پڑی:

”اس رات منظم طریقہ سے اس نے بینک مینجر کے گھر ڈاکا ڈالا تھا۔ جس نے پچیس لاکھ روپے کے پانچ سو کے پرانے نوٹوں کے بدلے میں پانچ لاکھ روپیہ کمیشن لے لئے تھے۔ بینک مینجر نہیں جانتا تھا کہ یہ بدنام ڈاکو شیر سنگھ کا پیسہ ہے۔“

بھی ہوتی ہے۔

ہارڈک اتنی مشکلوں کے باوجود پونم کی تلاش میں لگا رہتا ہے۔ لیکن پونم سے ملاقات اجنبیوں کی طرح ہوتی ہے۔ وہ ایک ایسے سفر پر چل پڑی تھی جہاں سے نکلنا بہت مشکل تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی باہر نہیں آ سکتی تھی۔ اندھیرے کے مسافر شیر سنگھ نے اس کے دل میں جگہ بنالی تھی۔

عہد حاضر میں جہاں ہندوستان نے اتنی ترقی کر لی ہے۔ وہاں ذات پات کے مسئلہ آج بھی ویسے ہی کھڑے ہیں ہارڈک ایک دلت لڑکا تھا پونم برہمن جس کے سبب پنچایت ان کو جان سے مارنے کی پوری کوشش کرتی ہے۔

”تمہارے اشارے پر اتنے برہمنوں کا خون ہوا۔ اس کے ذمہ دار تم ہو۔ اونچی برادری سے اتنی نفرت آخر کیوں؟ ارشاد بھائی تم کو بے گناہ سمجھائیں گے۔ ذات پات، اونچ نیچ کی گھٹیا سوچ ہے ہی ہمیں اس مقام تک پہنچایا ہے۔“

”اس کی شروعات میں نے نہیں کی تھی۔ یہ پنچایت کے سرغنہ نے فرمان دیا تھا کہ اونچی ذات کی لڑکی دلتوں میں شادی نہیں کر سکتی۔ اس طرح ہم دونوں کو جان سے مار دینے کا حکم سنا دیا گیا۔ قسمت اچھی تھی میں بچ گیا اور تم بھی“ ہارڈک نے صفائی دی۔“

پنچایت کے کھیا کو گرفتار کر لیا گیا۔ کھیا پر الزام تھا کہ اس نے قانون کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک الگ عدالتی نظام قائم کیا۔ ذات پات کو لے کر اتنا بڑا فیصلہ کر دیا۔ پورا دلت سماج ان کے اس فیصلہ کے خلاف کھڑا ہو گیا۔ پونم کے والد نے اغوا کرنے کی رپورٹ درج کروائی۔ شیر سنگھ جیسا ڈاکیت سارے گناہ چھوڑ کر گھاٹی سے دور پونم کو ساتھ لے کر ہمیشہ کے لیے چلا جاتا ہے۔ مدھیہ پردیش کے جنگلی علاقہ میں پہاڑی پر بنے مندر میں گجروں سے لپٹی ہوئی ایک رائفل ملی جس پر الوداع چمبل لکھا ہوا تھا۔

□□□

جون ۲۰۱۹ء تا اگست ۲۰۱۹ء



# جوش ملیح آبادی: حیات اور خدمات

برصغیر کے ادبا بلکہ ترقی پسند تحریک کے نمائندے اور نقیب صدائے انقلاب کا اگر تذکرہ کیا جائے تو جوش ملیح آبادی کا شمار صف اول میں ہوگا۔ انہوں نے آزادی ہند کی خاطر زبان و قلم سے وہ انقلاب برپا کر دیا تھا کہ غاصب انگریز کی نیندیں حرام ہو گئیں اور ان کے پر جوش و انقلابی کلام نے وطن کے متوالوں میں اس طرح روح احرار جگادی کہ مولیان ہند نے غاصب حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا ڈالی۔ جوش کا اصل نام شبیر حسن خاں تھا اور ابتدائی تخلص شبیر جو بعد میں جوش ہو گیا، ان کے والد شبیر احمد خان نے ان کا نام شبیر احمد خان رکھا تھا لیکن انہوں نے 1907 میں اپنا نام تبدیل کر کے شبیر حسن خان رکھ لیا۔ (ضیائے اردو، ضیاء المصطفیٰ مصباحی، باب جوش ملیح آبادی)

جوش کی پیدائش 5 دسمبر 1896 میں ملیح آباد کے محلہ مرزا گنج کے ایک متمول وادبی گھرانہ میں صبح چار بجے ہوئی۔ ان کے دادا محمد احمد خاں احمد، صاحب دیوان شاعر تھے، ان کے دیوان کا نام 'مخزن آلام' ہے، ان کے پردادا فقیر محمد خاں گویا بھی اپنے دور کے عظیم ادبا میں شمار ہوتے تھے اور دیوان گویا ان کا مجموعہ کلام ہے۔ جوش ملیح آبادی کو اردو ادب، میراث میں ملتا تھا، اس لیے ان کا شاعری سے شغف پیدا ہو جانا بالکل فطری سی بات تھی، چونکہ گھرانہ شاعرانہ فضا سے معمور تھا اسی سبب انہوں نے نو برس کی عمر سے ہی شاعری کا آغاز کر دیا، ان کا پہلا شعر ملاحظہ فرمائیں۔

شاعری کیوں نہ راس آئے مجھے

یہ میرا فن خاندانی ہے

مذکورہ شعر میں خود شاعر نے واضح کر دیا کہ شاعری ان کا میراثی حصہ ہے۔ اس لیے شاعرانہ طبیعت کی جانب میلان پیدا ہو جانا واضح سی بات ہے۔ بنیادی طور پر جوش غزل کے شاعر تھے مگر 1914 میں سلیم پانی پتی کے کہنے پر انہوں نے نظم گوئی کی بھی ابتدا کر دی اور اپنی پہلی نظم 'ہلال محرم' نام سے تحریر فرمائی۔ ان کی تعلیم دراصل گھر سے شروع ہوئی مگر اعلیٰ تعلیم کے حصول کی غرض سے سینٹ پور، آگرہ، لکھنؤ اور علی گڑھ کا سفر کرنا پڑا۔ 1914 میں آگرہ کا رخ کیا اور وہاں سینٹ پیٹرز کالج آگرہ سے سینئر آگرہ کیمرجس جولن ۱۹۲۰ تا اگست ۱۹۲۱ء



عظمت علی

ریسرچ اسکالر

جامعۃ المصطفیٰ العالمیہ، قم (ایران)

رابطہ: 9517269196

rascov205@gmail.com

کا امتحان پاس کیا، اس کے بعد کچھ مدت کے لیے عربی و فارسی کی تعلیم میں مشغول ہو گئے اور تقریباً چھ ماہ کی مدت، سنسکرت تمدن سے متعلقہ امور کو سمجھنے کے واسطے ٹیگور یونیورسٹی میں بسر کئے مگر دو برس بعد یعنی 1916 میں والد کی وفات نے ان پر مصائب کے پہاڑ توڑ دیئے اور یوں تعلیمی راہ میں بہت ساری رکاوٹیں حائل ہو گئیں، اس لیے وہ اپنی تعلیمی سرگرمی کو مزید آگے نہ بڑھا سکے، چنانچہ انہوں نے اپنے ماسلف آباء و اجداد کی روش پر چلتے ہوئے شعرو شاعری کی سنخوری کے ساتھ ساتھ انگریزی اور فارسی مضامین کو اردو قالب میں ڈھالنا شروع کیا۔

جوش حصول ملازمت کی غرض سے اقبال، عبدالماجد دریا آبادی، اکبر الہ آبادی، سلیمان ندوی کے سفارشی خطوط کے ساتھ 1924 میں حیدر آباد گئے اور آئندہ برس 1925 میں دارالترجمہ حیدر آباد میں ناظر ادب کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ وہاں انہوں نے میڈیسن کی کتابوں کا انگریزی سے اردو ترجمہ کیا اور دیگر خدمات میں بھی مصروف ہو گئے۔ قریب قریب دس برس وہاں خدمات انجام دیں مگر ورثہ میں ملی انقلابی طبیعت کو بیجاں پیدا ہوا اور آخر کار نظام حیدر آباد کی طرز حکمرانی کے خلاف ایک نظم کہہ ڈالی، جس کی پاداش میں انہیں ریاست بدر کر دیا گیا۔

ریاست بدری کے بعد انہوں نے دہلی کی جانب سفر کیا اور وہاں سے 1936 میں ماہنامہ رسالہ ’کلیم‘ کا اجراء کر دیا۔ رانا عبدالباقی اپنے مضمون ’اردو کے بے مثال نقیب جوش ملیح آبادی‘ میں رقمطراز ہیں کہ۔۔۔ (اس رسالہ میں) انہوں نے تو اتر سے اردو زبان کی ترقی اور ہندوستان کی برٹش راج سے آزادی کی حمایت میں مضامین لکھے۔ اسی ارتقائی دور میں

جوش کی شاعری میں نکھار آتا چلا گیا۔ ہندوستان میں آزادی کی تحریکیں شروع ہونے پر انہوں نے اپنے انقلابی کلام کے ذریعے ہندوستان میں آزادی کی اُمتنگ بیدار کرنے کے لئے کئی مضامین اور نظمیں لکھیں۔ سیاسی اُتار چڑھاؤ کے اسی دور میں جوش کی طبیعت مرثیہ نگاری پر مائل ہوئی، چنانچہ انہیں شہرہ آفاق نظمیں بالخصوص، حسین اور انقلاب، لکھنے پر شاعر انقلاب کا درجہ دیا گیا لیکن بہر صورت اردو زبان کی ترقی سے جوش کا دامن ہمیشہ ہی جڑا رہا۔ اس سے سبکدوش ہوتے ہی سرکاری رسالہ ماہنامہ ’آجکل‘ کے مدیر مقرر ہو گئے۔ 1948 تا 1955 علمی و ادبی خدمات انجام دیں اور یکم جنوری 1957 کو ترک سکونت کر کے پاکستان ہجرت کر گئے۔ پاکستان میں ابتدائی طور پر انجمن ترقی اردو کے بانی مولوی عبدالحق کے ہمراہ اردو زبان کی لغت کی تیاری میں خاطر خواہ کام کیا، اس کے علاوہ رسالہ اردو نامہ کی بھی ادارت فرمائی۔

بعض لوگوں کے خیال میں جوش اپنے مشکل الفاظ کے استعمال کے سبب زیادہ مورد قبول قرار نہ پائے لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہے، بلکہ یہی مشکل الفاظ کا استعمال انہیں دوسروں سے ممتاز بنا گیا۔ ان کی شعری صلاحیت کا اندازہ فراق گورکھپوری کی ان باتوں سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے جوش ملیح آبادی کو اپنا استاد تسلیم کیا ہے۔ انہوں نے اس بات کا اعتراف ایک ٹیلی ویژن انٹرویو کے دوران کیا تھا۔ انہیں اپنی غزل مکمل کرنے کے لیے ایک مناسب لفظ کی تلاش تھی، کافی مشقت کے بعد بھی انہیں کامیابی نہ ملی تو جھجکتے ہوئے جوش کے پاس گئے اور ان کی زبان سے وہ لفظ ایک رتن کی مانند برآمد ہوا۔

جوش ملیح آبادی کی رگوں میں خون آزادی گردش کر رہا تھا۔ آزادی وطن کی خاطر انہیں بڑی سے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے کلام میں جہاں صدائے انقلاب کی بازگشت سنائی دیتی ہے وہیں ادب کا حسین موقع بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ اسی باعث انہیں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے اپنے اخبار ’ہند‘ کلکتہ میں 1938 میں پہلی مرتبہ جوش کو ’شاعر انقلاب‘ کے لقب سے نوازا۔ شاعر انقلاب نے دونوں اصناف سخن نظم اور نثر میں طبع آزمائی کی اور بحسن و خوبی اسے نبھایا۔ ان کے شعری مجموعے مندرجہ ذیل ہیں:

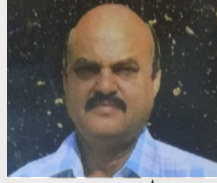
’روح ادب‘، شاعر کی راتیں، نقش و نگار، شعلہ و شبنم، فکر و نشاط، جنون و حکمت، حرف و حکایت، آیات و نعمات، عرش و فرش، رملش و رنگ، سنبل و سلاسل، سیف و سبزو سرود و سرودش، سموم و صبا، طلوع فکر، الہام و افکار، موحد و مفکر، نجوم و جواہر، آوازہ حق، پیغمبر اسلام، حسین و انقلاب، قطرہء قلزم، نوادر جوش، جوش کے مرثیے، عروسِ ادب حصہ اول و دوم، محراب و مضرب، دیوان جوش عرفانیات جوش وغیرہ۔

ان کی نثری کتابیں بھی ملاحظہ ہوں:

’مقالات زریں‘، اوراقِ سحر، اشارات، اردو زبان کے بے مثال نقیب جوش ملیح آبادی، جذبات فطرت، مقالات جوش، مکالمات جوش اور یادوں کی بارش وغیرہ۔

جوش ملیح آبادی کو ان کی عظیم علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں 1954 میں ’پدم بھوش‘ اور اڑو سے نوازا گیا جبکہ 2013 میں پاکستان کے اعلیٰ ریاستی اعزاز ’ہلال امتیاز‘ سے بھی نوازا گیا۔

□□□



سلیم انصاری  
HIG-3  
آنند نگر، ادھر تل، جہل پور

## میں زخموں کو پھر سے کریدوں

یادوں کے الم کو چھونے سے بھی خوف آنے لگا ہے  
عجب کشمکش ہے  
مرے ذہن و دل میں  
میں اب پھر سے  
محسوس کرنے لگا ہوں  
کہ زخموں کو اپنے کریدوں  
عجب کیا؟  
کوئی روشنی کی کرن  
مجھ کو اندر کی شرمندگی سے بچالے

## تمہیں کیا علم

میری نظموں کے سادہ لوح قاری  
تمہیں کیا علم؟  
میں برسوں سے  
اپنی سوچ کے جنگل میں تم کو  
بے سبب بھٹکا رہا ہوں  
بظاہر تم کو لگتا ہے  
کہ میری ساری نظمیں  
درد کے تاریک جنگل میں تمہاری ہم سفر ہیں  
مگر یہ سچ نہیں ہے  
میری نظموں کے سارے لفظ کاذب ہیں  
مرے لہجے کا سارا کرب جھوٹا ہے  
میری نظمیں تو  
میرے ذہن و دل میں منتشر، بے ربط، نا آسودہ  
امیدوں اور تمناؤں کا مسکن ہیں  
میری نظمیں تو میری بھی نہیں ہیں  
میری نظموں کے سادہ لوح قاری  
تمہیں کیا علم؟

بہت دن سے  
وہ یاد آیا نہیں ہے  
بہت دن سے میں نے  
اداسی کو اپنے خیالوں کی  
ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں میں سجایا نہیں ہے  
بہت دن سے  
کمرے میں گہری گھنی تیرگی ہے  
مگر اب  
بدن کو نئے خواب آنے لگے ہیں  
کتابوں میں سوکھے ہوئے پھول پھر مسکرانے لگے ہیں  
مگر ان میں خوشبوئی ہے  
مجھے یاد ہے  
تم نے جو پھول مجھ کو دیئے تھے  
تمہاری ہی خوشبو تھی ان میں  
مجھے خود ہی حیرت ہے کیسے؟  
درتچے سے باہر کا منظر بدلنے لگا ہے  
پرندے درختوں میں پھر چہچہانے لگے ہیں  
ہوائیں نئے گیت گانے لگی ہیں  
پہاڑوں سے گرتے ہوئے آبشاروں میں پھر سے  
دھنک مسکرانے لگی ہے  
مجھے ایسے موسم میں

# کووا اور کبوتر

احساس کا خاموش سمندر پھر اضطراب کی سونامی کی زد پر آ گیا۔ سونامی کی شورا انگیز لہروں سے سوچ کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ لمحہ لمحہ کرب ریز کیفیت میں دوڑنے لگا۔ پرندوں کی پھڑ پھڑاہٹ سے داخلی جہاں کا سکون درہم برہم ہو رہا تھا۔ اضطراب کا یہ سلسلہ کیوں اسی کے دماغ کو چوڑھا تھا، وہ بھی کبھی کبھی سوچتا رہتا لیکن کچھ سوچ نہیں پاتا۔ اس سب کے باوجود اسے یہ کرب ریز کیفیت پسند تھی اگرچہ اس کرب کی وجہ سے اسے کافی کچھ سہنا بھی پڑتا، بیوی کے طعنے..... رشتہ داروں کی بے رخی..... دوستوں کے طنز..... لیکن پھر بھی وہ اپنی سوچ پر مطمئن تھا۔ اس کی روح کو زیادہ تر گلاب رنگ عمارت کے رنگین شرارے ہی مضطرب کر دیتے تھے۔ گلابی رنگ کی بلند عمارت کے رنگین ماحول میں لوگوں کے رنگا رنگ خواب گشت کرتے رہتے کیونکہ عمارت کا یہ گلابی رنگ لوگوں کے خوابوں کی وہ سنہری علامت تھی جسے وہ پورے اعتماد کے ساتھ ماہرین فن کو سونپ دیتے تھے لیکن لوگوں کے اعتماد کا خواب صرف خواب ہی بن کر رہ جاتا۔ کیونکہ عمارت کے اندر کوؤں کے میکڑوں گھونسلے موجود تھے جو بلا کسی کراہت کے کچرے میں چونچ مار مار کر خواب کو سراب کی صورت دینے میں لگے رہتے۔ عمارت کا بلند قامت دروازہ پار کرتے ہی کوئے اور کبوتر کی پھڑ پھڑاہٹ شروع ہو جاتی۔ وہ شاندار آفس میں داخل ہوا اور کرسی پر بیٹھ کر سامنے پڑے ڈسک ٹاپ کو آن کر کے امانوں کے خوبصورت خاکوں میں رنگ بھرنے لگا۔ وہ بڑے اطمینان کے ساتھ مناسب رنگوں کو چن رہا تھا کہ حاکمیت اور سیاست کی سریلی آواز کے ٹرڈسٹرب کرنے لگے۔ جب سسر سے ٹرمل گئے تو حاکمیت کی آواز کانوں سے ٹکرائی:

”طرفدار! ذرا خاکوں کا ڈزائن دکھانا۔“

”سسر! رنگ بھر کے یا.....؟“

”نہیں..... بلارنگ کے.....“ باس کے ہونٹ مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ ہلنے لگے۔ ”منسٹر

صاحب دیکھنا چاہتے ہیں۔“

پرینٹ پر کلک کرتے ہی وہ سوچنے لگا کہ انسان کے بدلے مشین کتنی وفادار ہے کہ اپنا کام کمانڈ

جولن ۲۰۱۹ء تا اگست ۲۰۱۹ء



ڈاکٹر ریاض توحیدی

وادی پورہ

ہندوارہ، کشمیر

رابطہ: 7006544358

کے مطابق ہی انجام دیتی ہے اگر اس کے اندر بھی انسانی دماغ ہوتا تو پیٹ نہیں یہ اپنی پسند کے کیا کیا گل کھلاتی۔ پرنسز سے خاگوں کا ڈیزائن نکالتے ہوئے اس کے ہاتھ کاٹنے لگے۔ کاپی باس کے ٹیبل پر چھوڑتے ہی اسے گھٹن سی محسوس ہوئی اور وہ کمرے سے نکل کر باہر کاری ڈور میں چہل قدمی کرنے لگا۔ چہل قدمی کرتے کرتے اس کے کان پھڑپھڑا ہٹ سے بچنے لگے۔ وہ بے چینی کے عالم میں کینٹین کی طرف چل پڑا۔ کینٹین کا وسیع ہال لوگوں سے کچھ کھج بھرا ہوا تھا۔ وہ بھی ایک کونے میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے ہال پر ایک سرسری نظر دوڑائی۔ سامنے دیوار پر بڑے سائز کا ایل سی ڈی ٹیوٹکا ہوا تھا۔ اسکرین پر آرٹ گیلری کی نمائش چل رہی تھی۔ ہر کوئی کاری گر اپنے اپنے ڈیزائن کی خوبصورت پبلسٹی کر رہا تھا۔ ایک کاری گر اپنی ڈیزائن کی پبلسٹی کرتے ہوئے بڑے جوش سے کہتا تھا:

”علم وہ نور ہے جس سے اندھیرا بھگایا جاتا ہے۔ اس لئے ہمارا ڈیزائن یہ ہے کہ اس نور کو پھیلائے والوں کی مشعل کو اور بھی روشن کریں تاکہ ہمارا مستقبل روشن ہو جائے۔ اب ڈیزائننگ کے رنگوں میں کسی قسم کی ملاوٹ نہیں ہوگی بلکہ قابل معماروں کو ہی کام سونپا جائیگا۔“

ڈیزائننگ کے رنگوں کا ذکر سنتے ہی اس کا دھیان آفس کی سرسراہٹ کی طرف چلا گیا جہاں کوئے کبوتروں کو ہانک ہانک کر بھگا رہے تھے۔ اس کے اندر سے عجیب قسم کی بے چینی پیدا ہو گئی اور کان پھر پھڑپھڑا ہٹ سے بج اٹھے۔ وہ ابھی اسی حالت میں تھا کہ ویٹر کے مودبانہ لہجے نے اسے چونکا دیا:

”سر کیا چاہتے چائے کافی یا کافین کباب۔“  
”نہیں صرف چائے۔“ وہ ویٹر کے منہ کو

تکتے ہوئے بول پڑا۔ ”اچھا ایک بات سنو.....! کیا تمہیں بھی کوئی شور سنائی دیتا ہے؟“

”شور.....؟“ ویٹر مسکراتے ہوئے بول پڑا۔ ”یہاں تو خاموشی ہے صرف ایل سی ڈی پر چل رہے پروگرام کا شور ہے جس سے کم ہی لوگ تنگ آ جاتے ہیں باقی سب لوگ تو بڑے سکون سے کھاپی رہے ہیں۔“

اچھا اچھا ٹھیک ہے..... اب چائے لاؤ کہتے کہتے وہ اپنی بات پر افسوس کرنے لگا کہ اس نے کیوں ویٹر سے شور کے بارے میں پوچھا۔ پتہ نہیں وہ کیا سوچ رہا ہوگا۔ تھوڑی دیر کے بعد ویٹر نے چائے بھرا گلاس ٹیبل پر رکھ دیا۔ چائے پینے کے بعد وہ دوبارہ آفس میں چلا گیا۔ وہاں خالی کرسیوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے ناٹم دیکھ کر ڈسک ٹاپ آف کر دیا اور گلابی عمارت کی سیڑھیاں اترتے اترتے مین گیٹ تک جا پہنچا۔ اسکوٹر پر چڑھ کر وہ بازار کی جانب چل پڑا۔ بازار میں بڑی گہما گہمی کے باوجود اسے شور ہی شور سنائی دے رہا تھا۔ اس نے اسکوٹر میڈیکل شاپ کے سامنے روکا اور دکان کے اندر چلا گیا۔ سیلز مین کے سامنے نسخہ ڈال کر دوائی کے لئے پوچھ بیٹھا۔ سیلز مین شاید جان پہچان والا تھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے پہلے خیر خیر پوچھی اور اس کے بعد نسخے پر نظر ڈال کر بڑی اپنائیت سے کہا کہ اگر آپ میرا مانو گے تو اس کمپنی کے بدلے میں دوسری کمپنی کی دوائی دوں گا۔

”دوسری کمپنی کی دوائی۔“ وہ بھی یوں ہی پوچھ بیٹھا۔ ”کیا اس کمپنی کی دوائی موجود نہیں ہے؟“  
”وہ بھی ہیں..... لیکن.....“

”لیکن..... کیا.....؟“  
”یہ اصل میں کاروباری معاملہ ہے۔ ڈاکٹروں کے بھی اپنے معاملات ہوتے ہیں۔“

”اب اس میں ڈاکٹروں کا اور کیا معاملہ ہے۔“ وہ تھوڑ سا حیران ہو کر بول پڑا۔ ”ان کو تو پینٹ کا چپک اپ کر کے نسخہ لکھنا ہوتا ہے۔ باقی کاروباری معاملہ تو آپ کا ہے لیکن کاروبار سے زیادہ یہ انسانی جان کا مسئلہ ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔“ سیلز مین سر ہلاتے ہوئے بول پڑا۔ ”مگر اب یہ انسانی مسئلے کے بدلے کاروباری معاملہ ہی بنتا جا رہا ہے۔ وہ بھی اس لئے میں کہہ رہا ہوں کہ آپ کے ساتھ اچھے مراسم ہیں نہیں تو آج کل کون انسانیت کی پروا کرتا ہے۔“

سیلز مین کی گھول مول باتیں سن کر وہ تھوڑا بہت سمجھ گیا اور اس نے سیلز مین کے مشورے پر ہی عمل کرنا مناسب سمجھا۔ دوائی خرید کر وہ اسکوٹر پر پھر سے سوار ہوا لیکن اس دوران گلابی عمارت کی سرسراہٹ بازار کا شور اور میڈیکل شاپ کی کاروباری باتیں دماغ پر تھوڑا چلا رہی تھیں۔ دوران سفر اسے اپنے ایک قریبی ساتھی کی کال آئی۔ کال رسیو کر کے وہ سیدھا نفسیاتی سنٹر پہنچ گیا۔ سنٹر میں داخل ہوتے ہی وہ دوست کے چیمبر میں چلا گیا۔ یہ دونوں یونیورسٹی تک تعلیمی سفر کے ساتھی رہ چکے تھے۔ یہ تو بعد میں خود گلابی عمارت میں ملازم ہوا لیکن اس کے ساتھی نے نفسیات کی ڈگری حاصل کر کے نفسیاتی سنٹر میں ماہر نفسیات کا عہدہ سنبھال لیا۔ رسی علیک سلیک کے بعد دونوں ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ دوران گفتگو جونہی اسے اپنے ذہنی انتشار کے اظہار کرنے کا خیال آیا تو گھڑی نے راونڈ کرنے کا آرم بجا دیا۔ دوست نے اسے بھی وارڈس کی طرف چلنے کو کہا تاکہ ملاقات کا سلسلہ بے مزہ نہ ہو جائے۔ دونوں سنٹر کے وارڈس کی طرف چل پڑے۔ چونکہ اس کا دوست کافی عرصے سے سینٹر میں تعینات تھا اس لئے اسے

تقریباً ہر پیشینہ کی جانکاری حاصل تھی۔ سینٹر میں مریضوں کی آہوں اور سسکیوں سے حشر آفریں سماں چھایا ہوا تھا۔ ایک خوب روؤ جوان بار بار اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتے مارتے ہائے افسوس ہائے افسوس کر رہا تھا۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ اس نوجوان کو انجینئر بننے کا شوق تھا لیکن یورپ میں ایک دھماکے کے بعد وہاں کی پولیس نے اس کے خوابوں کو چکنا چور کر کے واپس بھیج دیا۔ ایک اور نوجوان زنجیروں میں بندھا ہوا تھا۔ وہ بار بار زنجی شیر کی طرح زنجیر سے رہائی کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ لیکچر بننے کا خواب سچائے ہوئے تھا اور اسی خواب کو پورا کرنے کے لئے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری بھی کر ڈالی لیکن انٹرویو کے بعد لسٹ میں اپنا نام نہ پا کر پاگل ہو گیا کیونکہ وہاں پر زیادہ تر سفارشی گھوڑوں نے ہی میدان مار لیا تھا۔ ایک اور بزرگ گم سم بیٹھا تھا لیکن اس کا سفید ریش آنسوؤں سے تر تھا۔ یہ سسکیاں لیتے لیتے گھر والوں کو یاد کر رہا تھا جو ڈرون حملے میں گھر سمیت زمین بوس ہو گئے تھے۔ اس طرح دوسرے لوگوں کی اندوہناک صورت حال دیکھ کر اس پر وحشت سی طاری ہو گئی۔ ان ہیبت ناک مناظر سے پھڑپھڑاہٹ کا تصادم پھر سے شروع ہوا۔ ایک اور آدمی کی حالت کچھ زیادہ ہی وحشت ناک تھی۔ وہ انسان کو دیکھ کر بھوت بھوت چلا رہا تھا۔ دوست نے اس کے چہرے کا حال دیکھ کر چیخیر کی راہ لی اور چیخیر میں بیٹھ کر پانی کا گلاس اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہنے لگا:

”ہمیں تو روز اسی قسم کی ہیبت ناک صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خیر پانی پی لو اب اس بارے میں سوچنے سے کیا فائدہ؟ انسان تو حیوان بن چکا ہے۔ نہ انسانیت اور نہ ہی آدمیت کا تصور باقی رہا ہے، صرف اپنے اپنے

شکار کی تلاش ہی زیر نظر رہتی ہے۔“ وہ پانی پی کر تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا اور پھر پوچھ بیٹھا کہ دوسرے لوگوں کی حالت زار تو سمجھ آ گئی لیکن بھوت بھوت چلانے والے کا قصہ کچھ سمجھ نہیں آیا۔ ”اچھا، وہ بھی بتاتا ہوں“ دوست نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”یہ جدید دور کا وہ انسان ہے جس کے سر پر ایمانداری کا بھوت سوار تھا۔ یہ جہاں بھی جاتا تھا تو اسے دیکھتے ہی بھوت بھوت کیسے گوشیاں شروع ہو جاتی تھیں۔ سماج کے طنز نے اسے نفسیاتی طور پر اتنا ڈسٹرپ کر دیا کہ وہ واقعی خود کو بھوت ہی سمجھ بیٹھا اور اس حالت کو پہنچ گیا۔“

بھوت والے قصے نے اس کے اوپر بے چینی سی طاری کر دی اور وہ گفتگو مختصر کر کے گھر کی جانب نکل پڑا۔ دن ڈھل چکا تھا۔ معمول کے برعکس جب وہ گھر میں دیر سے پہنچا تو پہلے بی بی کی ڈانٹ سنی پڑی اور چائے وغیرہ پینے کے بعد پھر وہی سوال کہ منے کی فیس کا کچھ انتظام ہوا کہ نہیں۔ منا کو انجینئر کی کا شوق تھا جس کیلئے کئی لاکھ ڈیونیشن کی ضرورت تھی، لیکن اس کی تنخواہ سے یہ اہم کام پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ ویسے تو یہ ایک ایسے شیش محل کا نگینہ تھا کہ جہاں پر صرف مول بڑھانے کے ہی جوہر آتے تھے لیکن وہ نگینے کا سودا گر نہیں بننا چاہتا تھا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد جب وہ بیڈ پر لیٹ گیا تو باس کی کال موصول ہوئی۔

”طرفدار! کل آفس ذرا ٹائم سے پہلے پہنچنا۔ وہ خاکہ رنگ بھر کر موصول ہوا ہے۔“

”لیکن سر وہ ایجنسی کی رپشن کا جو چھاپہ پڑا تھا؟“

”آپ بھی کس دنیا میں رہتے ہو، ان کے ساتھ بھی معاملہ طے ہوا۔“

”معاملہ طے ہوا.....؟“

”ہاں اب پریشانی کی کوئی بات نہیں،“ وہ ہاں آپ کے بچے کا جوائڈیشن والا معاملہ ہے نا، جس کے بارے میں تم نے کہا تھا۔ اس کی فکر مت کرنا۔“

کال کٹ ہونے کے بعد اس پر بے چینی کی سی کیفیت پھر طاری ہو گئی۔ وہ سوچنے لگا کہ اب ہر کام۔۔۔ کام کی طرح کیوں نہیں ہو جاتا ہے بلکہ ہر کام معاملہ کیوں بن جاتا ہے اور پھر معاملہ طے ہو جاتا ہے۔ یہ سوچتے سوچتے کرب کا کیڑا ذہن کو کورنے لگا۔ گلابی عمارت کا رنگین ماحول، میڈیکل شاپ کا معاملہ، مارکیٹ کی ہنگامہ خیزی، نفسیاتی سینٹر کا حشر ناک سماں..... اور اب باس کی آفر۔ آفر کا خیال آتے ہی اسے بچے کی انجینئر کی کا ڈیونیشن یاد آیا۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ آنکھیں بند کر کے کچھ سوچتا رہا لیکن آنکھیں کھلتے ہی اسے گلابی عمارت کے کچرے کی بدبو سی محسوس ہوئی اور وہ سوچنے لگا کہ اب میرے نام کا بھی ایک کچرہ ادا بنے گا۔ آدھی رات تک وہ کچرے کی بدبو کو خوشبو میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن یہ کام اسے گوبر میں گھی ملانے جیسا فن محسوس ہوتا رہا۔ ان ہی الجھنوں میں کروٹیں بدل بدل کر باقی رات بھی گزر گئی۔ صبح ہوتے ہی اسے بھوت کا سایہ کمرے میں منڈلاتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کے اندر سے پھڑپھڑاہٹ کا جان لیوا شور شروع ہوا۔ شور کے ساتھ ہی اسے یوں لگا کہ جیسے بھوت کا سایہ رفتہ رفتہ اسے اپنے گھیرے میں لے رہا ہے۔ تنگ ہو رہے گھیرے کی کک نے پھڑپھڑاہٹ کی گردش کو اور تیز کر دیا اور تیز گردش کے کرب ریز شور سے کوا اور کبوتر کان کے پردے پھاڑ کر پھڑ سے اڑ گئے۔

□□□



# کفن کی دکان

سلیم ایک باصلاحیت نوجوان ہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے نوکری کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹک رہا تھا۔ اسے نوکری ملنے کی کوئی صورت بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ سلیم ہی کی طرح ملک کے دیگر نوجوان بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود بڑی تعداد میں بے روزگار تھے۔ ہر طرف بے روزگاری کے سبب نوجوان دھرنے پر بیٹھے اور سرکار سے روزگار کا مطالبہ کرتے تھے۔ وہ اپنا پورا وقت بھوک ہڑتال، چکا جام، سرکاری افسران کا گھیراؤ، سرکار کے خلاف نعرے بازی اور میڈیا کے سامنے گہار لگانے میں صرف کر رہے تھے، لیکن سرکار کے کان میں جوں تک نہیں رینگ رہی تھی۔ احتجاج کا نتیجہ صفر ہی رہا۔ سرکار روزگار کے نام پہ نوجوانوں سے پکوڑے تلوا رہی تھی۔ نوکری کے نام پر انہیں کچھ مل رہا تھا تو صرف پھیکو جملے، جس کو سن کر ملک کا ہر نوجوان جبر و زیادتی کرنے پر مجبور ہوتا جا رہا تھا۔ پورے ملک میں دہشت اور وحشت کا ماحول بنتا جا رہا تھا۔

سلیم ایک ایسے شہر میں رہتا تھا، جہاں پر کثیر تعداد مسلمانوں کی تھی۔ اس شہر میں اعلیٰ طبقے اور رئیس لوگوں کی تعداد نہ کے برابر تھی۔ وہاں کے تمام لوگ چھوٹا موٹا ہی سہی لیکن اپنا خود کا کاروبار کرتے تھے، جس سے ان کی روزی روٹی بحسن خوبی چل رہی تھی۔ تمام شہری تافان اور سالن نوشی میں مست تھے۔ سلیم کو جب بڑی محنت، مشقت اور کوشش کے باوجود نوکری نہیں ملی تو اس نے اپنے والد کے کاروبار میں ہاتھ بٹانا شروع کر دیا اور اسی کو اپنے مقدر کی روزی مان کر محنت اور ایمانداری سے اپنے کام کو سرانجام دینے لگا۔

لیکن وقت کی تبدیلی نے انہیں اس موڑ پر لا کر کھڑا کر دیا تھا کہ اب ان کا پیٹ پالنا بھی دشوار ہو گیا تھا۔ حکومت کی نئی پالیسی اور نئے اقدام سے چھوٹے موٹے کاروباری سڑک پر آگئے۔ نوٹ بندی اور جی ایس ٹی چھوٹے موٹے کاروباریوں پر قہر بن کر گری۔ نوٹ بندی کی مار اور جی ایس ٹی کے بھار سے چھوٹی موٹی ملوں اور کمپنیوں میں تالے لگ گئے۔ بڑی تعداد میں لوگ بے روزگار ہو گئے۔ متوسط طبقے کے لوگ غریب ہوتے گئے اور غریب آدمی غریب تر ہوتا گیا۔ حکومت کی اس نئی



محمد نہال افروز

ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو  
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی  
حیدرآباد، تلنگانہ  
رابطہ: 9032815440



پالیسی اور اقدام نے سلیم کی بھی کمر توڑ کر رکھ دی۔ اب یہاں اسے روزگار کی کوئی تدبیر سوجھ نہیں رہی تھی۔ عمیق تدقیق کے بعد بھی جب روزی روٹی کی کوئی تدبیر نہیں سوجھی تو اس نے مجبوراً اپنا پیدائشی شہر چھوڑ کر ایک نئے شہر کا رخ کیا، جہاں وہ اپنا کاروبار نئے سرے سے شروع کرنے کا خواب لے کر گیا تھا۔

سلیم کے لیے وہ شہر تو نیا تھا، لیکن اس کے حالات میں کوئی تجدید نہیں آئی۔ سلیم وہاں بھی روزی روٹی کے لیے در در بھٹکتا رہا۔ اسے اپنے خواب کو حقیقی جامہ پہنانے کا کوئی عمل سوجھ نہیں رہا تھا۔ آخر کار بڑی محنت مشقت کے بعد اسے ایک آئی ٹی کمپنی میں کلرک کی نوکری مل گئی۔ وہ بہت محنت اور ایمانداری سے اپنے کام کو سرانجام دینے لگا۔ سلیم کی محنت اور لگن کو دیکھتے ہوئے کمپنی کا مالک اس کا متواتر پر موثر کرتا گیا۔ اس طرح سلیم بہت کم مدت میں کلرک سے منیجر کے عہدے پر فائز ہو گیا۔ اس کی قابلیت اور ترقی کی وجہ سے کمپنی کے دوسرے ملازم سلیم سے حسد کرنے لگے۔ کمپنی کے سارے ملازم سلیم کے خلاف ہو گئے اور ایک جٹ ہو کر کمپنی کے مالک سے اس کی شکایت کرنے لگے۔ اس پر یہ الزام لگایا گیا کہ سلیم اپنی ذمہ داری کو نہیں سمجھتا۔ وہ اکثر اپنے چیمبر سے غائب رہتا ہے۔ باوجود اس کے اس کو پرموشن پہ پرموشن مل رہا۔ سلیم کو کمپنی جو ان کیے ہوئے ابھی چند مہینے ہی ہوئے ہیں اور اسے کلرک سے منیجر تک بنادیا گیا اور تنخواہ بھی دوسرے ملازمین سے دوگنی کر دی گئی۔

ملازمین کی شکایت پر کمپنی کے مالک نے سلیم سے کام کے دوران غائب ہونے کا سبب پوچھا تو اس نے کہا، ”سر میں اپنے کسی ضروری کام کے لیے چیمبر سے تھوڑی دیر کے لیے باہر نکلتا ہوں، لیکن اس

سے آپ کے کام پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ میں اپنا کام پورا کرنے کے بعد ہی آفس سے باہر جاتا ہوں۔ بلکہ اپنے ساتھیوں سے زیادہ کام کرتا ہوں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔ مجھے تم سے یا تمہارے کام کرنے کے طریقے سے کوئی دقت نہیں ہے۔ مجھے تو تمہارا کام بہت پسند ہے، لیکن کمپنی کے رولس ریگولیشن بھی تو ہوتے ہیں۔ تمہارے اس طرح کام کے وقت غائب ہونے سے دوسرے ملازمین پر برا اثر پڑ رہا ہے۔ مجھے ان کو جواب بھی تو دینا ہوتا ہے۔“

چونکہ کمپنی مجھے نماز پڑھنا ہوتا ہے۔ اس لیے مجھے دن میں دو تین بار تھوڑے تھوڑے وقت کے لیے اپنے کام کو روکنا پڑتا ہے۔ نماز کے لیے تو آپ کو وقت دینا ہی پڑے گا۔ آپ مجھ پر بھروسہ رکھیں، نماز سے آپ کے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں آئے گی۔ میں آپ کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ کمپنی کے لیے میں اپنے ساتھیوں سے زیادہ کام کر کے دوں گا۔ جیسا کہ اب تک کرتا آیا ہوں۔“

مجھے تمہارے نماز پڑھنے سے کوئی دقت نہیں ہے، لیکن تم کو کمپنی کے رول کے تحت ہی کام کرنا ہوگا۔ صبح نو بجے سے شام پانچ بجے تک تم کو کام کرنا ہوگا۔ دوپہر میں تمام ملازمین کی طرح تم کو بھی ایک گھنٹے کی چھٹی ملے گی۔ اس وقت میں تم نماز پڑھ لو اور دوسری ضروریات سے بھی فارغ ہو لو۔ اس کے علاوہ میں آپ کے لیے اور کچھ نہیں کر سکتا۔“

سلیم کو یہ بات اچھی نہیں لگی۔ اس نے کمپنی کے مالک سے کہا، ”ہر نماز کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ اس وقت مجھے اپنے کام کو روکنا ہی ہوگا۔ اگر آپ مجھے اتنا وقت نہیں دے سکتے تو میں آپ کی کمپنی میں کام نہیں کر سکتا۔“

”جیسی تمہاری مرضی۔ تمہیں کمپنی کے رول

کے مطابق ہی کام کرنا ہوگا۔ میں صرف تمہاری وجہ سے کمپنی کے تمام ملازمین کو ناراض نہیں کر سکتا۔“ کمپنی کے مالک نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

سلیم مذہبی قسم کا انسان تھا۔ نماز تو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ اس لیے مجبوراً اس نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔ اتنے دن کام کرنے کی وجہ سے اسے اپنے اوپر اعتبار ہو گیا تھا اور یہ آئی ٹی کا دور بھی تھا۔ اسی لیے وہ بے فکر تھا کہ کہیں نہ کہیں اسے اچھی نوکری مل جائے گی۔ لیکن اسے خیال آیا کہ ہر کمپنی میں کام کے دوران نماز پڑھنے کا مسئلہ ضرور آئے گا۔ یہ خیال آتے ہی اس نے نوکری کرنے کا ارادہ اپنے دل سے نکال دیا اور اپنا خود کا کاروبار کرنے کا ارادہ کیا۔

سلیم کو اتنے دن آئی ٹی کمپنی میں کام کرنے سے اس میدان میں اچھا خاصہ تجربہ ہو گیا تھا اور اتنے سیسے بھی جمع کر لیے تھے کہ اپنا خود کا کام شروع کر سکتا تھا۔ اس لیے اس نے اسی شہر میں لیز پر روم لے کر ایک آئی ٹی شاپ کھول لیا۔ شاپ کا نام اس نے Miracle IT Solution رکھا۔ ساتھ میں سلیم نے یہ بھی درج کر دیا کہ One Stop for All Solution۔ اپنی شناخت کو قائم رکھنے اور اردو سے بے پناہ محبت کی وجہ سے اس نے سائن بورڈ پر اردو میں بھی شاپ کا نام لکھوا دیا۔ ”معجزہ آئی ٹی سلوشن“ ایک جگہ رکھے اور آئی ٹی سے متعلق سارے کام کو مناسب قیمت پر حل کروائیے۔

لیکن سلیم یہاں بھی کامیاب نہیں ہوا۔ پہلی بات تو یہ کہ اس نے کمپنی کی نوکری چھوڑ کر اسی شہر میں یہ شاپ کھولی تھی، جس سے کمپنی کے مالک سمیت ملازمین کو بھی اچھا نہیں لگا۔ اسی لیے وہ لوگ سلیم کے کام میں آڑے آنے لگے اور اسے شاپ بند کرنے کے لیے طرح طرح کی دھمکیاں

ملنے لگیں۔ دوسری بات یہ کہ شہر میں نفرتیں اتنی بڑھ چکی تھیں کہ ہندو طبقہ کے زیادہ تر لوگ اردو سائن بورڈ دیکھ کر اس کی شاپ پر نہیں جاتے تھے اور مسلمان طبقہ اپنے کو سیکولر ثابت کرنے کے چکر میں سلیم کی دکان پر جانے کی بات تو دور اس طرف دیکھتے بھی نہیں تھے۔ تیسری بات یہ کہ وہ دکان ہی میں نماز پڑھتا اور عبادت بھی کرتا تھا، جس سے لوگوں کو اکثر اپنے کام کے لیے انتظار کرنا پڑتا تھا۔ اسی وجہ سے جو تھوڑے بہت کسٹمر آتے بھی تھے دھیرے دھیرے وہ بھی آنا بند ہو گئے۔

شاپ پر کسٹمر کے نہ آنے کی وجہ سے آمدنی بند ہوتی گئی اور خرچ اپنی جگہ پر ہی تھا۔ ہر مہینے روم کا کرایہ دینا، بجلی کا بل دینا۔ اس کے علاوہ دوسرے اخراجات تو تھے ہی۔ اوپر سے دوسرے شہر میں سلیم کا اپنا خرچ بھی تو تھا۔ کمپنی میں کام کر کے جو پیسے اس نے جمع کیے تھے وہ بھی تھوڑے دنوں میں ختم ہو گئے۔ پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے اس کے حالات اتنے خراب ہو گئے کہ دو وقت کے روٹی کا انتظام کرنا تو دور اس کو اپنی آبرو بچانی مشکل ہو گئی۔ اس لیے مجبور ہو کر اس نے شاپ بند کر دی اور اپنے آبائی شہر واپس چلا آیا۔

واپس آ کر سلیم نے دیکھا کہ ملک کے حالات بدتر ہوتے ہوئے بھی یہاں پر امن اور سکون ہے۔ اس شہر میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ضرور ہے، لیکن ہر قوم کے لوگ آپس میں مل جل کر رہتے ہیں اور ایک دوسرے کی خوشی اور غمی دونوں میں شامل ہوا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ عید، دیوالی، لوہڑی اور کرسکس ہر تہوار تمام شہریوں کے لیے خوشی کا دن ہوتا ہے۔ شہر کے تمام لوگ نئے سال کی خوشیاں بھی ایک ساتھ منایا کرتے ہیں۔ لوگ اس شہر کی لگا جہنی تہذیب کی مثالیں

دیا کرتے ہیں۔ اس شہر میں کسی بھی فرقہ پرست کی دال نہیں گتی تھی۔ وہ مذہب اور فرقے کے نام پر انسانوں کا ہٹوارا نہیں کر پارہے تھے۔ لیکن اچانک ایک عجیب و غریب واقعہ ہو گیا۔ ہوا یہ کہ ایک باریش بزرگ ایک گائے لے کر راستے سے جا رہے تھے۔ وہ اتنے بزرگ ہو گئے تھے کہ ان سے گائے کی دیکھ بھال نہیں ہو پارہی تھی۔ اس لیے وہ گائے کو اپنے کسی رشتے دار کو دینے جا رہے تھے۔ راستے میں کچھ نوجوان اس بزرگ کو روک کر کہنے لگے، ”او بڈھے، ہڈی کی دکان، کہاں لیے جا رہا ہے گؤ ماتا کو۔“

”فلاں جگہ میرا ایک رشتہ دار رہتا ہے، اسی کو دینے جا رہا ہوں۔ اس بڑھاپے میں اب اس کی دیکھ بھال مجھ سے نہیں ہوتی۔“ بزرگ نے ایمانداری سے جواب دیا۔

ان میں سے ایک نے کہا، ”بڈھا جھوٹ بول رہا ہے۔“

”سالہا بڈھا یہ گائے قصائی کو بیچنے جا رہا ہے۔“ دوسرا فوراً بول پڑا۔

”ہاں ہاں تم بالکل صحیح کہہ رہے ہو۔“ تیسرے نے دوسرے کی بات پر مہر لگادی۔ ”مارو بڈھے کو۔“ چوتھے نے چلاتے ہوئے کہا۔

اتنا کہتے ہی سارے نوجوان اس شخص پر ٹوٹ پڑے اور اسے پیٹنے لگے۔ وہ بوڑھا شخص کہتا رہا کہ میری بات سنئے۔ میں گائے قصائی کو بیچنے نہیں جا رہا ہوں۔ بچ میں، میں اسے اپنے رشتے دار کو ہی دینے جا رہا ہوں۔ تم لوگوں کو یقین نہیں ہے تو میرے ساتھ چلو اور میرے رشتے دار سے بھی پوچھ لو، لیکن وہ لوگ اس شخص کو اتنی بے رحمی سے پیٹ رہے تھے کہ اس کی آواز نوجوانوں

کے کان تک پہنچ ہی نہیں رہی تھی، بلکہ یوں کہیے کہ وہ نوجوان ان کی باتیں سننا ہی نہیں چاہ رہے تھے۔ ان لوگوں نے اس بزرگ کو صرف اس لیے پیٹ پیٹ کر مار ڈالا کہ وہ باریش تھے۔

سوشل میڈیا کے توسط سے یہ خبر لوگوں تک پہنچتے ہی شہر میں فساد ہو گیا۔ چاروں طرف افراتفری کا ماحول بن گیا۔ پورا شہر نفسا نفسی میں مبتلا تھا۔ کیا ہندو، کیا مسلمان، کیا سکھ اور کیا عیسائی کوئی بھی خود کو محفوظ نہیں سمجھ رہا تھا۔ حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ شہر کی سڑکیں خون سے رنگ گئی تھیں۔ محلوں کی گلیاں لاشوں سے اٹ گئی تھیں۔ شہر میں اتنی لاشیں جمع ہوتی گئیں کہ کفن کم پڑنے لگے۔ سلیم شہر کی اس قہر پر پاحالات سے پریشان نہیں ہوا بلکہ وہ خوش ہوا۔ اس لیے نہیں کہ وہ اس قہر پر پا کرنے والے دہشت پسندوں میں سے تھا۔

سلیم یہ قہر ناک منظر دیکھ کر ایک گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس کی آنکھیں کسی چیز پر پکٹی ہوئی تھیں، لیکن اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس وقت وہ اپنی آنکھوں سے نہیں بلکہ دماغ کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔ اسے روزگار کی ایک پوری دنیا نظر آ رہی تھی۔ وہ خوش تھا اس لیے کہ اسے ہنگامی طور پر روزگار مل گیا تھا۔ ایسا روزگار، جس سے اس کی روزی روٹی کا مسئلہ فی الحال حل ہو گیا۔ اس نے کفن کی دکان کھول لی۔ یہ سوچ کر کہ انسان کو جیتنے جی بھر پیٹ کھانا میسر آیا ہو یا نہ ہو۔ سر چھپانے کے لیے چھت نصیب ہوئی ہو یا نہ ہو۔ زندگی میں تن ڈھکنے کے لیے کپڑے رہے ہوں یا نہ رہے ہوں، مگر مرنے کے بعد اسے نیا کفن ضرور ملتا ہے۔

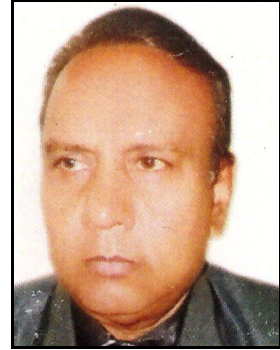
□□□

# پیار کا ماڈرن گیم

راکیش خوشی اور تعجب کے ملے جلے تاثرات میں تھا۔ خوشی اس لئے کہ عمر کی اس پادان پر اسے کسی سے پیار ہو گیا ہے اور تعجب اس لئے کہ اس سے آدھی عمر کی نہایت ہی خوبصورت ”خوب روڑی“ نے اس کے پر پوزل کو قبول ہی نہیں کیا بلکہ اس نے پیار کا اقرار و اظہار بھی کیا ہے۔ جبکہ وہ جانتی ہے کہ راکیش شادی شدہ اور دو بالغ بچوں کا باپ ہے۔

سردی کی اندھیری رات تھی۔ ہر شخص، چرند پرند اپنے اپنے آشیانے میں دیکے و سہے ہوئے تھے۔ کہیں سے کسی کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کبھی کبھی باہر سڑک سے اکا دکا آنے جانے والوں کے قدموں کی چاپ صاف سنائی دیتی تھی۔ لیکن وہ آوازیں بھی آہستہ آہستہ خاموشی کی طرف گامزن تھیں۔ دور تک چاروں جانب سناٹا پھرا ہوا تھا۔ راکیش اور کویتا ڈنر کے بعد ڈرائنگ روم میں ایک دوسرے کے روبرو تھے۔ اور دونوں ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنوں کو صاف سن رہے تھے۔ راکیش بے حد مغموم و افسردہ اور مصائب و آلام سے متاثر خوشی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ کویتا اس کی تمام تر پریشانیوں سے اچھی طرح واقف تھی۔ اس نے نمرتا سے شادی تو کر لی تھی لیکن وہ اسے کبھی پیار نہیں کر سکا تھا۔ اس پر نمرتا کا اس کے تئیں گھٹیا سلوک، بات بات پر لڑنا جھگڑنا، بدتمیزی سے پیش آنا روز کا معمول تھا۔ ان کی شادی کو ایک ڈور میں باندھے رکھنے والی صرف ایک شے تھی بچے جن کی پرورش کرتے کرتے بائیس سال نہ جانے کیسے بیت گئے۔ کویتا نے سرگوشی سے کہا کہ وہ اس قدر فکر مند اور پریشان کیوں ہے۔؟ سنائے کو چیرتی ہوئی اس کی ہچکی لیتی ہوئی رونے کی آواز نے ماحول کو بے حد سنجیدہ کر دیا تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے بچے کی طرح رو رہا تھا۔ کویتا نے اس کو دلاسا دیتے ہوئے اس کا سراپتی گود میں رکھ لیا اور کہا کہ مرد ہو کر رو رہے ہو مگر تو دنیا کے تمام تر مصائب و آلام کو دہر کر کے ہمہ وقت مقابلے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ مرد چٹیل چٹانوں کو کاٹ کر راستہ بنا لیتے ہیں۔ سنگلاخ و بنجر زمینوں کو سرسبز و شاداب کرنے کا انہیں ملکہ حاصل ہے۔ آسمانوں کی وسعتوں کی کھوج بھی مرد ہی کر رہے ہیں اور پھر آپ تو تعلیم یافتہ، محنتی، بردبار، وقت کی قدر کرتے ہوئے برے وقت کو مات دینے

جولن ۲۰۱۹ء تا اگست ۲۰۱۹ء



ندیم رازی

198، چودھری ہاؤس

گل شہید، مراد آباد

رابطہ: 8188937127

والے شخص ہیں اور پھر آپ نے اپنی ۲۲ رسالہ شادی کو نبھا کر یہ ثابت بھی کر دیا ہے وہ کچھ بڑا تاتا ہوا غمخوش ہو گیا اور اس نے کوتیا کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ وہ موم کی طرح پگھل گئی تھی۔ ہوش آنے پر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اپنے کمرے کی جانب چلی گئی۔ راکیش دیر تک جاگتا رہا اور نہ جانے کب نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ جب وہ بیدار ہوا تو صبح کے ۶ بجے تھے۔ اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور وہاں سے چل دیا۔ کوتیا جب تک سو کر اٹھی راکیش جاچکا تھا۔ اس کے ماتا پتا بھائی بھابھی بھی الہ آباد سے واپس آگئے تھے۔

راکیش لکھنؤ کے ایک مال میں اسسٹنٹ سپروائزر تھا۔ گزشتہ شب وہ یہاں اپنے دوست امریش سے ملنے آیا تھا۔ کوتیا امریش کی چھوٹی بہن ہے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ کوتیا کے علاوہ سب الہ آباد کسی شادی کی تقریب میں شامل ہونے گئے ہیں تو وہ واپس جانے لگا لیکن کوتیا نے اسے یہ کہہ کر روک لیا کہ یہ سب صبح ۹، ۸ بجے تک آجائیں گے۔ آپ یہاں رک جائیے اور آرام کریں.... کوتیا بنارس یونیورسٹی میں ایم اے کی طالبہ تھی۔ امریش اور اسکے والدین اس کے لئے کوئی مناسب رشتہ تلاش کر رہے تھے۔ لیکن انہیں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ راکیش اور امریش دونوں لکھنؤ یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ اور پتا مسٹر ہریش گپتا میڈیکل کالج میں کلرک۔ جو ریٹائر ہونے کے بعد اپنی آبائی رہائش بنارس میں مقیم ہو گئے تھے۔ ان کی اکلوتی بیٹی کویتا راکیش کے لئے انجان نہیں تھی۔ وہ اس کے لئے کھانا پروستی و بستر وغیرہ لگاتی کویتا کبھی بھی راکیش کی توجہ کا مرکز نہ تھی۔ گزشتہ

شب پہلی بار وہ راکیش پر غیر معمولی طور سے مہربان تھی۔

وہ لکھنؤ بھی نہیں پہنچا تھا کہ اس کے

راکیش لکھنؤ کے ایک مال میں اسسٹنٹ سپروائزر تھا۔ گزشتہ شب وہ یہاں اپنے دوست امریش سے ملنے آیا تھا۔ کوتیا امریش کی چھوٹی بہن ہے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ کوتیا کے علاوہ سب الہ آباد کسی شادی کی تقریب میں شامل ہونے گئے ہیں تو وہ واپس جانے لگا لیکن کوتیا نے اسے یہ کہہ کر روک لیا کہ یہ سب صبح ۹، ۸ بجے تک آجائیں گے۔ آپ یہاں رک جائیے اور آرام کریں.... کوتیا بنارس یونیورسٹی میں ایم اے کی طالبہ تھی۔ امریش اور اسکے والدین اس کے لئے کوئی مناسب رشتہ تلاش کر رہے تھے۔ لیکن انہیں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ راکیش اور امریش دونوں لکھنؤ یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ اور پتا مسٹر ہریش گپتا میڈیکل کالج میں کلرک۔ جو ریٹائر ہونے کے بعد اپنی آبائی رہائش بنارس میں مقیم ہو گئے تھے۔ ان کی اکلوتی بیٹی کویتا راکیش کے لئے انجان نہیں تھی۔ وہ اس کے لئے کھانا پروستی و بستر وغیرہ لگاتی کویتا کبھی بھی راکیش کی توجہ کا مرکز نہ تھی۔ گزشتہ شب پہلی بار وہ راکیش پر غیر معمولی طور سے مہربان تھی۔

وہ لکھنؤ بھی نہیں پہنچا تھا کہ اس کے موبائل پر کوتیا کا ایس ایم ایس تھا۔ جس میں بغیر بتائے گھر سے چلے جانے کی شکایت اور پھر سے جلد آنے کی درخواست درج تھی۔

موبائل پر کوتیا کا ایس ایم ایس تھا۔ جس میں اچانک اور بغیر بتائے گھر سے چلے جانے کی

شکایت اور پھر سے جلد آنے کی درخواست درج تھی۔ راکیش نے ایس ایم ایس کے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ وہ پورے دن گزشتہ رات کے واقعات کو محسوس کرتا رہا۔ ایک لمحے کے لئے بھی وہ اس سے باہر نہ نکل سکا تاہم شام ہوتے ہوتے کوتیا کا فون آ گیا تھا۔ وہ اسے اپنا بہترین دوست ماننے لگی تھی اور وہ اس کے غم میں شریک ہونا چاہتی ہے اور اسے اپنے تمام درد و غم اس پر آشکار کرنے کا اختیار دے دیا تھا۔

دونوں کے بیچ موبائل بات چیت کا ذریعہ بن گیا تھا۔ راکیش اپنی چھوٹی سے چھوٹی بات اس سے شیر کرتا۔ اپنی بیوی کی بے اعتنائی بے توجہی اور بے مروتی کا تذکرہ کرتا وہ بھی اس کے ساتھ اپنی تمام تر عہد و پیمان کا اظہار کرتی اس نے محسوس کر لیا تھا کہ دوستی سے آگے معاملات بڑھ گئے ہیں۔ آخر کار ایک شب اس نے اپنے پیار کا اظہار کر ہی دیا اور ساتھ ہی یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ ایک اچھا سا لڑکا دیکھ کر اس کی شادی کرانے میں معاونت کرے گا۔ مزید اس نے یہ بھی کہا کہ محبت کا مطلب حاصل کرنا ہی نہیں ہوتا بلکہ کھونا بھی ہوتا ہے۔ اس نے بھی راکیش کی محبت کو قبول کر کے اظہار محبت کر دیا تھا اور ہمہ وقت اس کی راہ نکلنے لگی تھی۔ اپنی بے چینی کا تذکرہ بھی وہ بار بار کرتی تھی۔ دونوں کے بیچ تحائف کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ ایس ایم ایس کے ذریعہ پیار بھرے پیغامات کا تبادلہ ہوتا رہا۔ راکیش کی دیوانگی بڑھتی جا رہی تھی۔ دن رات اس کا ہی خیال رہتا۔ کام کاج میں اس کی عدم دلچسپی نے اس کے لئے کچھ پریشانی پیدا کر دی تھیں۔ لیکن وہ بے فکر ہواؤں کے دوش پر خیالات کی ایک ایسی دنیا بسائے تھا جس میں

صرف کویتا کا ہی گذر تھا۔ وہ اس کو اپنا جیون ساتھی تو نہیں بنا سکتا تھا لیکن اسے اپنے پیار کا یقین دلا کر محبت کی وادیوں کی سیر تو کراہی سکتا تھا۔ دوریاں قربتوں میں بدلنے لگیں وہ ایک دوسرے کے بغیر بے چین رہتے اور موقع ملتے ہی دونوں مل بیٹھتے۔

ایک دن جب کویتا کے والدین بھابی اور بھائی اس کیلئے سورت (گجرات) میں ایک لڑکا دیکھنے گئے تھے تو اس نے راکیش کو اپنے گھر بلا لیا۔ راکیش پوری تیاری کے ساتھ اپنی محبت کو بروئے کار لانے کے لئے وقت مقررہ پر اس کے گھر پہنچ گیا۔ آج وہ اپنی زندگی کے بہترین لمحات سے لطف اندوز ہونے کے ارادے سے لبریز تھا۔ اور اس لڑکی کے روبرو تھا۔ جو اسے بے انتہا پیار کرتی تھی۔ اور وہ اسے بھی اتنا ہی چاہتا تھا جتنا کہ وہ.... زندگی میں پہلی بار اسے ایک سچے پیار کا احساس ہو رہا تھا۔ اسے اپنی منزل پر پہنچنے کی بے انتہا مسرت تھی۔ وہ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے زیادہ خوش قسمت انسان تصور کر رہا تھا۔ کہ وہ بے حد پیار کرنے والی لڑکی کے روبرو ہوگا۔ وہ بھی مکمل تنہائی میں اس احساس سے اس کے جسم کے تمام تار جھنجھنا اٹھے تھے۔

حسب پروگرام وہ کویتا کے روبرو تھا۔ وہی وقت اور وہی رات تھی لیکن فرق یہ تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے پیار میں ملوث تھے۔ بے تکلفانہ گفتگو کے بعد کھانا پروس دیا گیا۔ ان دونوں نے مل کر ساتھ کھانا کھا یا شب کے ۹ بج چکے تھے اور دونوں ڈرائنگ روم کے ایک صوفے پر ایک دوسرے کی بانہوں میں تھے.... بات کچھ اور آگے بڑھتی اس سے پہلے

اس نے خود کو راکیش کی بانہوں سے چھڑا کر سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ کویتا نے اسے اس کا وعدہ یاد دلایا کہ وہ اس کی شادی کرانے کے لئے ایک اچھا لڑکا تلاش کرے گا۔ اس نے اپنے وعدے کی تجدید کرتے

دونوں کے بیچ موبائل بات چیت کا ذریعہ بن گیا تھا۔ راکیش اپنی چھوٹی سے چھوٹی بات اس سے شیر کرتا۔ اپنی بیوی کی بے اعتنائی بے توجہی اور بے مروتی کا تذکرہ کرتا وہ بھی اس کے ساتھ اپنی تمام تر عہد و پیاں کا اظہار کرتی اس نے محسوس کر لیا تھا کہ دوستی سے آگے معاملات بڑھ گئے ہیں۔ آخر کار ایک شب اس نے اپنے پیار کا اظہار کر ہی دیا اور ساتھ ہی یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ ایک اچھا سا لڑکا دیکھ کر اس کی شادی کرانے میں معاونت کرے گا۔ مزید اس نے یہ بھی کہا کہ محبت کا مطلب حاصل کرنا ہی نہیں ہوتا بلکہ کھونا بھی ہوتا ہے۔ اس نے بھی راکیش کی محبت کو قبول کر کے اظہار محبت کر دیا تھا اور ہمہ وقت اس کی راہ ہلکنے لگی تھی۔ اپنی بے چینی کا تذکرہ بھی وہ بار بار کرتی تھی۔ دونوں کے بیچ تحائف کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ ایس ایم ایس کے ذریعہ پیار بھرے پیغامات کا تبادلہ ہوتا رہا۔ راکیش کی دیوانگی بڑھتی جا رہی تھی۔ دن رات اس کا ہی خیال رہتا۔ کام کاج میں اس کی عدم دلچسپی نے اس کے لئے کچھ پریشانیوں پیدا کر دی تھیں۔

ہوئے کہا کہ وہ پوری کوشش کر رہا ہے.... اگر میں اس سلسلے میں آپ کی مدد کروں تو....“ راکیش نے متعجب ہو کر پوچھا کہ کیسی مدد....؟ کویتا نے کچھ ہچکچاتے شرما تے ہوئے کہا:

”دراصل میں اپنی بھابی کی چھوٹی بہن کی شادی میں وجہ مکار سے ملی تھی۔ وہ پی سی، ایس میں کامیابی حاصل کر کے اس شہر کی تحصیل میں نائب تحصیل دار کے عہدے پر گامزن ہے۔ ۳۲ سال کی عمر میں اس نے اپنی محنت اور کوششوں سے یہ عہدہ حاصل کیا ہے۔ وہ اتنا اسمارٹ تو نہیں ہے جتنے آپ ہیں لیکن ایک مکمل رعب دار شخصیت کے مالک ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے چھپ چھپ کر مل رہے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ براہ راست میرے دل میں اتر گئے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو چاہنے لگے ہیں اور ہم شادی کے پوتر بندھن میں بندھنا چاہتے ہیں۔“

کویتا کے یہ الفاظ اس کے جسم میں گرم سیسہ کی طرح پیوست ہوتے گئے۔ اس کا پورا وجود ایک انجانے خوف اور ندامت کے حصار میں تھا۔ اس کی پوری دنیا تاش کے پتوں کی طرح بکھرتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ تمام ارمان ریت کے ڈھیر بن گئے تھے۔ جنہیں آسمانی بجلیوں نے خاکستر کر دیا تھا۔

اس نے خود کو سنبھالنے کے بعد کہا:

”پھر پریشانی کیا ہے۔ اپنے ماتا پتا سے کہو یا پھر وہ اپنے ماتا پتا کو تمہارا ہاتھ مانگنے یہاں بھیجیں۔“ دراصل وہ ایک دلت لڑکا ہے۔ آپ میرے ماتا پتا بھائی کے بہت قریب ہو اور آپ ہی ان کو اس رشتہ کے لئے تیار کر سکتے ہو میرا یہ چھوٹا سا کام آپ کو ہر حال میں کرنا ہوگا۔“

پیار کے اس موڈ رن گیم کو سمجھنے میں اسے دیر تو ہو گئی تھی لیکن اندھیر نہیں....؟

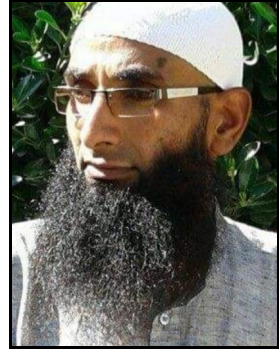
□□□

## نہیں میرے بابا...!

- نہیں میرے بابا! میں نے لاکھ کوشش کی کہ خود کو اس سے چھڑا سکوں لیکن کامیاب نہ ہوئی۔  
میرے بابا مجھے معاف کرنا۔
- نہیں میرے بابا! میں اسکول وردی میں ہی ملبوس تھی۔ وہ کل پانچ تھے۔ چار کو تو میں جانتی  
بھی نہیں۔ پانچواں میرا اپنا کزن تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ آپ نے اس کی زمین ہڑپ لی ہے  
اس لئے....
- اس نے کہا میرے ساتھ گھر آ جاؤ، میں نوٹس دے دوں گا تاکہ امتحان میں اول آسکوں.... نہیں  
نہیں، اس نے مجھے جوں پلا یا اور پھر مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔
- بابا مجھے معاف کرنا! میری وجہ سے آپ کا سر نیچا ہو گیا۔ بابا مجھے معلوم نہیں تھا کہ واش روم میں کسی  
نے کیمرا لگا رکھا ہے۔
- بابا! آپ بیمار تھے۔ دودن سے بھیڑوں نے بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔ اس لئے میں ان کو جنگل لے  
گئی۔ نہیں بابا، شیر، چیتا، بھالو اور بھیڑ نے کچھ نہیں کیا البتہ انسانوں کی شکل میں تین بھیڑیوں  
نے میرے کپڑے اتارے اور نوچ نوچ کر مار ڈالا۔
- بابا! میں مجبور ہو گئی۔ پرنسپل نے کہا کہ اگر میں اسٹیج پر نہیں ناچوں گی تو وہ میرا ایڈمیشن کینسل کرا  
دیں گے۔ بابا اگر ایڈمیشن کینسل ہو جاتا تو میرے گھر میں پڑے رہنے سے آپ کو اور زیادہ دکھا  
ہوتا۔ بابا مجھے معاف کر دونا!
- میری سہیلی ریشما اب گندی گندی باتیں کرتی ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اس کے پاپا بہت بڑی ٹی وی لائے  
ہیں اور وہ دیر تک بالی ووڈ کی پکچرس دیکھتے ہیں۔ بابا پکچر تصویر کو کہتے ہیں۔ بالی ووڈ کس کو کہتے ہیں؟
- بابا! آج ٹیچر نے ہمیں پڑھایا کہ لڑکیاں نعمت ہوتی ہیں لیکن می کہہ رہی تھیں کہ آپ بہت پریشان  
رہتے ہیں۔ ابھی سے میری شادی کے لئے پیسے جمع کر رہے ہیں۔ کیا ٹیچر نے غلط پڑھایا بابا!

□□□

جولن ۲۰۱۹ء تا اگست ۲۰۱۹ء



ڈاکٹر فیض قاضی آبادی

اسسٹنٹ پروفیسر  
شعبہ اردو ڈگری کالج  
ہندوارہ، کشمیر

رابطہ: 9622706839

# غزل

ہر قدم تحفہ غم تو نے دیا ہے مجھ کو  
زندگی تجھ سے بہر طور گلہ ہے مجھ کو

ریزہ ریزہ میں کیا کرتا ہوں خود کو یکجا  
اندر اندر ہی کوئی توڑ رہا ہے مجھ کو

جسم نیلا ہوا جاتا ہے اسی زہر سے اب  
جب سے احساس کے پچھونے ڈسا ہے مجھ کو

زندگی ہے کسی خوش رنگ غبارے کی طرح  
آپ کا حسن بھی دائم نہ بقا ہے مجھ کو

وقت کو میں نے بھی لے رکھا ہے اپنی زد پر  
وقت نے اپنے نشانے پہ رکھا ہے مجھ کو

خود سے میں دور ہوا جاتا ہوں لمحہ لمحہ  
اپنی سرحد میں کوئی کھینچ رہا ہے مجھ کو

مقصود بستی

آئی ٹی آئی، سدیشورنگر، جھانسی

موبائل: 7052895105

# غزل

عجب ادا سے تڑپ کر ہوا بدن خاموش  
ہر اک ادا میں رہی دعوتِ سخن خاموش

ہوئے ہیں وقت سے پہلے یہ کس طرح بالغ  
ابھی سے ہو گئے بچوں کے بانکپن خاموش

ہر ایک آنکھ پھٹی رہ گئی ہے حیرت سے  
پہن کے آیا جو کاغذ کا پیرہن خاموش

اثر زمانے پہ ڈالے بغیر رہتا نہیں  
میں ایک گوشہ میں کرتا ہوں کارفن خاموش

بہت سے لوگ ہیں جو ہم سے اچھا کہتے ہیں  
کبھی ہوا ہے نہ ہوگا یہاں سخن خاموش

معاف کرنا اگر ناگوار خاطر ہو  
رہے گی کیسے یہ ماتھے کی ہر شکن خاموش

نیا شعور نئی فکر دے رہا ہوں سعید  
رہیں گے کب تلک یہ صاحب سخن خاموش

ڈاکٹر سعید گورکھپوری

سی ۱۸۳۱/۷۱۰، ترکمانپور

سلطان خان مسجد، گورکھپور



## غزل

چاند تارے زمیں پہ لانے کی  
بات کرتا ہے وہ فسانے کی  
ان کی عادت ہے ظالم ڈھانے کی  
میری فطرت ہے مسکرانے کی  
کیسا خاموش کارواں نکلا  
رہبری مل گئی زمانے کی  
روز کل کل کی بات کرتے ہیں  
بات کرتے ہیں دل جلانے کی  
کتنے ظالم ہیں توڑ کر دل وہ  
بات کرتے ہیں مسکرانے کی  
آپ تو قید ہیں تصور میں  
آپ زحمت کریں نہ آنے کی  
اے فہد کون ہم کو سمجھے گا  
خاک ہیں ہم کس آستانے کی

محمد فہد پاشا

بی ۱۱۹، نواب واجد علی شاہ روڈ، گارڈن ریج، کلکتہ  
موبائل: 9804228315

## غزل

جام عشق کا اگر آپ نے پیا ہی نہیں  
لذت حیات پھر آپ کو پتہ ہی نہیں  
عشق باکمال ہے عشق لازوال ہے  
عشق جس نے کر لیا وہ کبھی مرا ہی نہیں  
آئینے میں دیر تک خو کو دیکھتا رہا  
دیکھنا تھا جو مجھے وہ مجھے دکھا ہی نہیں  
وقت ہی سوال ہے وقت ہی جواب ہے  
وقت کا یہ سلسلہ آج تک رکا ہی نہیں  
عشق اور موت میں مت موازنہ کرو  
موت کو بقا نہیں عشق کو فنا ہی نہیں  
دامن حیات سے عشق گر نکال دیں  
دامن حیات میں پھر تو کچھ بچا ہی نہیں  
اے جواد جان لو ہے خدا تو مان لو  
جس کی ابتدا نہیں اس کی انتہا ہی نہیں

جواد حیدر جواد

پورہ باغ، مبارکپور، اعظم گڑھ  
موبائل: 8090964952

زیر نظر شعری مجموعہ ڈاکٹر سعید گورکھپوری کا دیوان ہے۔ انہوں نے دیوان کے شرائط پورے کئے اور گورکھپور کے ادبی حلقوں کو چیلنج کیا کہ دیکھو آج بھی دیوان کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اچھی شاعری کی جاسکتی ہے۔ یہ کتاب آج کے اشاعتی معیار پر بھلے ہی پوری نہ اترتی ہو اور اس کے پروف کی غلطیوں کو بھی نظر انداز کر دیا جائے تو قاری کو ڈاکٹر سعید کے جذبے کو سلام کرنا چاہے۔ دیوان سعید میں کل 212 غزلیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ایک حمد ہے اور کئی درجن پھٹکر شعر بھی ہیں۔ دیوان سعید بہترین اور خوبصورت غزلوں سے پر ہے۔ سعید کی غزلیں زمانے کے نئے تقاضوں کو پورا کرتی ہیں۔ الطاف حسین حالی نے غزل کے مضامین اور خیالات کو از حد وسعت دینے کی بات یقینی بنانے کا عندیہ دیا ہے (مقدمہ شعر و شاعری)۔ دیکھا جائے تو دیوان سعید میں آپ کو ہر موضوع پر اشعار مل جائیں گے۔

اطوار پہ حیرت ہے نہ عادات پہ حیرت ہوتی نہیں اب ہم کو کسی بات پہ حیرت ایسی کبھی امید نہ تھی عشوہ گروں سے ہوتی ہے ہمیں ان کی عنایات سے حیرت الطاف حسین حالی کے مطابق شعر کی لوگوں کو ایسی ضرورت نہیں جیسی کی بھوک میں کھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان کو طرح طرح کے کھانے میسر نہ ہو تو وہ تمام عمر ایک ہی کھانے پر زندہ رہ سکتا ہے مگر شاعری کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ شاعری میں تلون اور تنوع نہ ہو تو اس سے جی اکتانے لگتا ہے۔ جس طرح ایک ہی بھیروی راگ سے طبعیت مکدر ہو جاتی ہے اسی طرح شعر میں ہمیشہ ایک ہی مضمون باندھا جائے تو شعر سے نفرت ہو جاتی ہے (مقدمہ شعر و شاعری ص: 132) سعید

گورکھپوری کی شاعری الطاف حسین حالی کی معیار پر پوری اترتی ہے۔ پورے دیوان میں الگ الگ موضوعات کی بھرمار ہے۔ نہ صرف یہ کہ مضامین الگ الگ ہیں بلکہ انداز شاعری میں زبردست انفرادیت پائی جاتی ہے۔ انہوں نے عشقیہ مضامین کو بھی عجیب قسم کی معاشرتی کیفیت میں پیش کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر مابعد جدید



تدوین : ڈاکٹر سعید گورکھپوری  
مبصر : ذاکر حسین ذاکر  
قیمت : روپے  
ناشر :  
ملنے کا پتہ :

دنیا Post modern world کا عاشق ہے جہاں اسے اپنی شخصیت کے اظہار Revealing of Personality کی کچھ زیادہ ہی ضرورت ہے۔ ملاحظہ ہو۔

بے کیفی نگاہ میں کیوں بتلا ہیں آپ کہیے نہ صاف مجھ سے کہ مجھ سے خفا ہیں آپ شعر دیکھئے۔

فن کی کمی کے باوجود ہو ہی گئی غزل سعید

مشکل زمین تھی مگر مصرعہ رول بہت ہوا  
.....

میری ہاری ہوئی بازی کی ستائش کیسی  
جیت ہی جیت ہوا کرتی ہے ہر ہار کی کاٹ  
.....

اب کون بنے گا دل بیمار کا وارث  
ہے کون بھلا مفلس و نادار کا وارث  
سعید کی شاعری میں ایک ہی طرح کے مضامین نہیں ملتے۔ قافیے بھی متنوع ہیں اور ردیف بھی۔ سینکڑوں ایسے شعر ہیں جو دل کی گہرائیوں کو چھلنی کرتے ہیں۔ فکر کو مضبوط کرتے ہیں اور تخیل کے پرواز کو اونچائیوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ فکر عام طور پر ناکامی معاشرہ کی دلالت کرتی ہے مگر اس موضوع کو بھی سعید نے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

یہ بات آپ کی ہمیں تسلیم ہے بہت دنیا میں آج نام کو تنظیم ہے بہت سروقہ پراگئی پسند کا بہترین شعر درج ہے۔  
بڑھتا ہی چلا جاتا ہوں میں جانب منزل  
مستقبل زریں کی ہے مظہر مری ہمت  
آج کے ڈیجیٹل دور میں جہاں ایک سے ایک فوٹو جینک کیمرے بازار کی رونق بڑھا رہے ہیں۔ اسے قدامت پسندی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ سعید نے اپنی کتاب میں اپنا فوٹو سیاہ سفید whiteBlack لگایا ہے۔ اور کپشن دیا ہے۔  
حرف اخلاص رکھ کے کاغذ پر  
میں قلم کا وقار دیکھوں گا  
حوصلہ افزائی کی تمنا کے ساتھ اس عزم کا عیادہ کیا گیا ہے کہ اس کے بعد دیوان سعید کا دوسرا حصہ بھی جلد منظر عام پر آئے گا۔ دل تھام کر بیٹھئے۔  
□□□

روایتوں کے حصار سے نکلنے کی کوشش ہی نہیں کی، دوسری وجہ ہمارے یہاں اچھے نظم نگاروں کا فقدان ہے۔“ (ستیہ پال آنند کا تخلیقی شعور اور عالمی عصری آگہی صفحہ ۲۲)

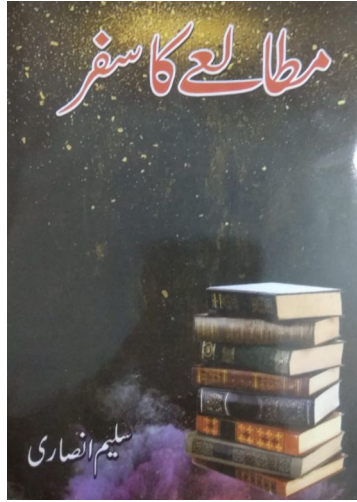
☆ ”صافی سماج میں پروڈکٹ ہی نہیں انسانی سوچ بھی گلوبلائز ہو گئی ہے، آج کا انسان زیادہ باخبر اور informed ہے جس کے نتیجے میں عمل اور رد عمل کے مابین زمانی وقفہ لمحوں میں سمٹ گیا ہے، اب مابعد جدید تخلیق کار تنہائی، قنوطیت اور انتشار کا شکار نہیں اور نہ ہی اپنی ذات کے خول میں بند ہے۔“ (مابعد جدید نظم۔ ایک نام تمام جائزہ صفحہ ۳۲)

☆ ”رتن سنگھ کے افسانے بڑے کینوس پر پینٹ کی گئی مائکروسائز کی تصویریں ہیں جنہیں سمجھنے کے لئے magnifying glass کی ضرورت ہوتی ہے، ان کے یہاں سیاسی، سماجی اور نفسیاتی کشمکش، انسانی جبلت اور عالمی مسائل و مصائب کا اظہار نہایت خوبصورتی سے ہوا ہے۔“ (مانک موتی کی تخلیقی اساس صفحہ ۷۱)

اس طرح کی اور بھی مثالیں مطالعے کا سفر سے پیش کی جاسکتی ہیں۔ مجموعی طور پر یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں سلیم انصاری کے انفرادی تنقیدی نظریات اور ان کے ترجمانی مطالعے کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے جو یقینی طور پر ادب خصوصاً نئے ادب کے طالب علموں کے لئے توجہ اور دلچسپی کا باعث ہے۔ مجھے امید ہے کہ سلیم انصاری کی یہ کتاب ”مطالعے کا سفر“ ادب کے سنجیدہ قارئین اور ناقدین شعر و ادب کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہے گی۔

□□□

مجموعی مطالعہ اور تجزیہ نہیں کیا گیا، جس سے ایک نقصان تو یہ ہوا کہ غالب کی شخصیت دو حصوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی۔ اس سے قطع نظر غالب کے تقریباً تمام ناقدین متفق ہیں کہ غالب ایک فطری اور آفاقی شاعر ہے اور اس کی شاعری کا کینوس کثیر الجہت



مصنف : سلیم انصاری

مبصر : شہناز بیگم

قیمت :

ناشر : حالی پبلیکیشنز، کشمیری نگر، دہلی

ملنے کا پتہ : حالی پبلیکیشنز، کشمیری نگر، دہلی

اور اس کے جذبول کی ساری کیفیات رنگا رنگ ہے۔“ (غالب کی شاعری میں امیجری کی تلاش صفحہ ۱۶، ۱۷)

☆ ”آزاد نثری نظم اردو شاعری کی ایسی اصناف ہیں جو اپنے جنم سے لے کر آج تک معقوب ہی ٹھہری ہیں جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہمارے بیشتر ناقدین شعر و ادب نے ذہنی طور پر غزل کی صدیوں پرانی

ادبی اور تنقیدی مضامین پر مشتمل سلیم انصاری کی کتاب ”مطالعے کا سفر“ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں نہ سفر کم ہے نہ مطالعہ۔ بات غالب سے شروع ہو کر اقبال تک آتے آتے ایک صدی کا سفر طے کر چکی ہوتی ہے۔ اور دوسری صدی میں اس قدر موڑ ہیں کہ کتاب کو کبھی دوبارہ اخیر سے پڑھنا پڑتا ہے کبھی درمیان سے اور سلیم انصاری کی فکر کی یہی خوبی ہے کہ ان کے یہاں نہ عصری حسیت ہاتھ سے جاتی ہے نہ اس کا نظام۔ زیر نظر کتاب میں صرف اٹھائیس مضامین شامل ہیں لیکن میری معلومات کے مطابق سلیم انصاری نے تقریباً ۴۰۰ مضامین لکھے ہیں جو ایک عرصہ سے ملک و بیرون ملک کے رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان میں سے کئی مضامین کے تراجم یورپ اور ایشیا کی کئی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ جب اہل قلم علاقہ بدلتے ہیں تو ان کی تخلیق کے رنگ بھی بدل جاتے ہیں، جب نظریہ بدلتے ہیں تو افہام و تفہیم کے پیمانے اور زبان و لہجہ بھی نیا ہو جاتا ہے۔ جملے، محاورے، ڈکشن اور اسلوب وغیرہ میں بھی نمایاں تبدیلی محسوس کی جاسکتی ہے، یہ ساری تبدیلیاں سلیم انصاری کے یہاں بھی واضح ہیں کیونکہ دورانِ ملازمت، تبادلوں کے سبب ان کی خانہ بدوشی نے ان کے تجربات اور قوت مشاہدہ میں پختگی پیدا کی ہے۔ اور یہ تبدیلیوں کا اندازہ مطالعے کا سفر میں شامل مضامین کے مطالعے سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ ان کی سفارشات اور تراکیب نئی ہیں، چند مثالیں ملاحظہ کریں۔

☆ ”ہمارے بعض ناقدین کو یہ شکایت بھی ہے کہ غالب کی اردو اور فارسی شاعری کا

پرمغز اور بصیرت افروز ہے۔ عنوان اس قدر متحرک ہے کہ قاری کو پورا رسالہ پڑھنے کی ترغیب کرتا ہے۔ اپنے اپنے طور پر کبھی مضمولات قابل قدر ہیں۔ مدیر محترم کی کاوش قابل ستائش ہے۔ خدا سے دعا گو ہوں کہ ان کی قلم میں اور طاقت پیدا ہو اور وہ اردو زبان و ادب کی خدمت کرتے رہیں۔

عرفان اللہ خاں  
(احین)

ادبی نشین کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ یہ خصوصی شمارہ پروفیسر محمود الہی پر ریسرچ کرنے والوں کے لئے دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ محمود الہی صاحب کے نام سے ہم سب واقف ضرور ہیں مگر ان کی ادبی زندگی اور کاموں سے ہم سب کم واقف ہیں۔ اس رسالے میں ان کی ادبی زندگی کے تقریباً ہر گوشے کو شامل کیا گیا ہے۔

شمارے میں شامل تمام مضامین جہاں بے حد معلوماتی ہیں وہیں شمارے کا پہلا مضمون 'ادبی سومنا تھ کا محمود جسے پروفیسر مجاور حسین صاحب نے لکھا ہے وہ دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت معلوماتی بھی ہے۔

میں ادبی نشین کے ایڈیٹر کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کے ساتھ دعا کرتا ہوں کہ ایسے ہی وہ آگے بڑھتے رہیں۔ اتنے کم وقت میں اس رسالے میں ادب میں جو مقام حاصل کیا ہے وہ کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔

مصباح الدین انصاری  
(ہاتھرس)

جون ۲۰۱۹ء تا اگست ۲۰۱۹ء

بہت اچھا کیا کہ پروفیسر محمود الہی کے شعری اثاثے کو محفوظ کر دیا ہے۔

سرورق اور بیک کور کے دونوں صفحات پر پروفیسر محمود الہی سے متعلق یادگار تصاویر شائع کی گئی ہیں جن کے سرورق کے اندر کے صفحہ پر اس شمارے کی ہیجداہم معلومات کو کوائف کے تحت یکجا کیا گیا ہے جس میں استاد محترم پروفیسر محمود الہی کی مختصر سوانح کو اشارتاً پیش کیا گیا ہے۔

اس خاص شمارے کی اشاعت کے لئے ڈاکٹر سلیم احمد کو مبارکباد پیش کروں گا کہ ان کی ادارت میں یہ خاص شمارہ شائع ہوا ہے جس کا مطالعہ ادب کے شائقین اور اردو کے سچے ہی خواہوں اور خدمت گزاروں کے لئے ہیجدا مفید ہوگا۔

ڈاکٹر شکیل احمد  
(مؤ)

سہ ماہی ادبی نشین کا تازہ شمارہ مارچ تا مئی ۲۰۱۹ء باصرہ نواز ہوا۔ آپ کی محبتوں کا مشکور و ممنون ہوں۔ اردو رسائل میں اپنے معیار کی وجہ سے اس رسالے نے ایک منفرد پہچان بنائی ہے۔ زبان و ادب کی خدمت کیلئے وقف یہ رسالہ یقیناً قابل قدر ہے۔ آپ کی کاوشوں سے آج یہ رسالہ ملک کے اہم ترین رسالوں میں شمار ہوتا ہے۔ بیشک آپ اردو کے سپاہی ہیں۔ سرورق نہایت ہی عمدہ ہے۔ پروفیسر محمود الہی صاحب کے بارے میں تفصیلی معلومات سے قاری کے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ پہلا ہی مضمون پروفیسر مجاور حسین صاحب کا بعنوان 'ادبی سومنا تھ کا محمود' انتہائی



سہ ماہی ادبی نشین، لکھنؤ کا تازہ شمارہ مارچ تا مئی ۲۰۱۹ء پروفیسر محمود الہی مرحوم پر خصوصی شمارہ کے تحت شائع ہوا ہے۔ ادبی نشین کے اس خصوصی شمارے میں ادارہ سے مراسلات تک کے مستقل کالم کے ساتھ سات مختلف ابواب کے تحت مضامین اور تاثرات شائع کئے گئے ہیں جن سے ایڈیٹر ڈاکٹر سلیم احمد کے بہتر شعور و سلیقہ کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

حرف آغاز پروفیسر مجاور حسین صاحب کے ادبی سومنا تھ کا محمود نامی تاثراتی اور تنقیدی مضمون سے ہوتا ہے جس کے حصول میں ایڈیٹر کی محنت شاقہ یقیناً شامل ہے اور یہ اس شمارے کا ہیجداہم مضمون ہے۔ عموماً خصوصی شمارے کے اخیر میں نمونہ نثری اور شعری انتخاب کو جگہ دی جاتی ہے۔

اس شمارے کے باب اول کو اندازِ تحریر سے موسوم کر کے پروفیسر محمود الہی مرحوم کے دواہم مضامین، میں نے فراق کو دیکھا اور لکھنؤ اسکول اور قصیدہ نگاری کو جگہ دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی شعری نگارشات کو بھی شمارے میں شامل کر کے ان کی قدر و قیمت میں اضافہ کیا گیا ہے۔ مدیر محترم نے





مبارک

عید

ادبی نشیمن، تمام تارکین کرام کی خدمت میں عید الفطر کی مبارکباد پیش کرتا ہے۔





## سراج اورنگ آبادی (۱۷۶۴ء-۱۷۱۲ء)

### غزل

خبر تیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی  
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی  
شہ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی  
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی  
چلی سمت غیب سیں (۱) کیا ہوا کہ چمن ظہور کا جل گیا  
مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہو سو ہری رہی  
نظر تغافل یار کا گلہ کس زباں سیں بیاں کروں  
کہ شراب صد قدح آرزو خم دل میں تھی سو بھری رہی  
وہ عجب گھڑی تھی میں جس گھڑی لیا درس نسخہ عشق کا  
کہ کتاب عقل کی طاق پر جوں دھری تھی تیوں ہی دھری رہی  
ترے جوش حیرت حسن کا اثر اس قدر سیں (۲) یہاں ہوا  
کہ نہ آئے میں رہی جلانہ پری کوں (۳) جلوہ گری رہی  
کیا خاک آتش عشق نے دل بے نوائے سراج کوں (۴)  
نہ خطر رہا نہ حذر رہا مگر ایک بے خطری رہی  
(۱) سے (۲) زیادہ (۳) کی (۴) کو

### مختصر تعارف

سراج اورنگ آبادی کا پورا نام سید شاہ سراج الدین حسینی اور تخلص سراج تھا۔ ان کے اجداد مدینہ منورہ سے ہجرت کر کے اتر پردیش کے ضلع مظفر نگر قصبہ جانشہ اور نوابی علاقہ میں آکر آباد ہو گئے۔ سراج کی پیدائش ۲۱ مارچ ۱۷۱۲ء مطابق ۱۳ سفر ۱۱۲۴ھ کو اورنگ آباد میں ہوئی۔ سراج بچپن ہی سے باصلاحیت اور حاضر دماغ واقع ہوئے تھے۔ انہیں اسی وجہ سے کم عمری میں قرآن اور حدیث کے علاوہ عربی، فارسی اور دکنی زبان میں مہارت حاصل ہو گئی۔ انہیں تصوف سے خاص رغبت تھی۔ اسی لیے ان پر بے خبری کی کیفیت طاری رہتی تھی۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ۱۷۳۹ء میں جب ادبی دنیا ولی دکنی یا ولی اورنگ آبادی کو ادب میں ایک اہم مقام دے چکی تھی، تو اسی دوران سراج اورنگ آبادی کو ولی کا جانشین تسلیم کیا جانے لگا تھا لیکن انہوں نے اپنے پیر شاہ عبدالرحمن چشتی کی ہدایت پر روایتی غزل سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا اور پوری طرح تصوف کے رنگ میں رنگ گئے۔

سراج کو ادب کے ساتھ ساتھ موسیقی میں بھی دستگاہ تھی۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں کچھ موسیقی کے تجربے بھی کیے۔ سراج جس شہر میں رہے وہاں محفل سماع کا اہتمام ضرور ہوتا۔ ان کے شاگردوں میں ضیا الدین پروانہ، لالا بے کشن بچان، مہاسنگھ کہنہیل محقر کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ سراج نے غزلیں، رباعیاں، قصیدہ اور مثنوی (بستان خیال) جیسی اصناف میں طبع آزمائی کی۔

زندگی کے آخری دنوں میں مختلف بیماریوں کا شکار ہونے کے بعد ۵۲ سال کی عمر میں ۱۶ اپریل ۱۷۶۴ء کو سراج کی موت واقع ہو گئی اور انہیں شیخ کتوان قبرستان، اورنگ آباد میں سپرد خاک کیا گیا۔